RCgd. L. NO.7243

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1971

اس پرچہ میں

اسلامی آئین کے بنیادی خط و خال

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ **طلوعِ اسلام** لاہور

بدل اشتراک
سالانہ ——— پاکستان ——— دس روپے
سالانہ ——— غیر ممالک ——— ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

ٹیلیفون :- ۸۰۸۰۰
خط و کتابت :- ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵- بی، گلبرگ، لاہور

جلد (۲۴) | فروری ۱۹۷۱ء | نمبر (۲)

فہرست

(۱) لمعات ——— ۲
(۲) نقد و نظر ——— (مومن بھٹک لیڈر) ——— ۱۵
(۳) قرآنی آئین کے بنیادی اصول ——— ۱۷
(۴) کوئی مملکت اسلامی کب کہلا سکتی ہے؟ ——— ۴۹
(۵) قائداعظمؒ اور دو قومی نظریہ ——— ۶۰
(۶) طلوعِ اسلام کالج فنڈ ——— (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) ——— ۷۰
(۷) لعنت لعنت ——— (محترم چوہدری عطاء اللہ صاحب ایڈووکیٹ) ——— ۷۳
(۸) حقائق و عبر ——— (ذلت کی حقیقی وجہ) ——— ۷۸

ایڈیٹر۔ محمد خلیلی، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف، مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تیری صورت سے تجھے درد آشنا سمجھا تھا میں

گزشتہ دسمبر کے آخری ہفتہ میں، کراچی میں، مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کی "عظیم الشان" کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس سے پہلے اس قسم کی کانفرنسیں، رباط میں اور اس کے بعد جدہ میں بھی منعقد ہو چکی ہیں۔ رباط میں تو مسلم ممالک کے سربراہ مل کر بیٹھے تھے اور جدہ اور کراچی میں ان ممالک کے وزرائے خارجہ یکجا جمع ہوئے۔ یہ بدنصیب قوم ساری دنیا میں جن ناساعد حالات میں گھری ہوئی ہے اور اسے ہر مقام پر جن مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس کی وجہ سے، اس قسم کی کانفرنسوں کے ساتھ عوام کی بڑی بڑی توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کا نتیجہ — نشستند و گفتند و برخاستند سے زیادہ کچھ مرتب نہیں ہوتا، تو ان پر گہری مایوسی چھا جاتی ہے۔ کراچی کی کانفرنس، اس اعتبار سے بھی سب سے زیادہ مایوس کن ثابت ہوئی کہ پاکستان میں منعقد ہونے کے باوجود، اس نے نہ تو ہندوستانی مسلمانوں پر بے پناہ مظالم کے خلاف ایک لفظ تک کہا اور نہ ہی تنازعہ کشمیر جیسے اہم مسئلہ کو درخورِ اعتنا سمجھا، حالانکہ آزاد کشمیر کے صدر، سردار عبدالقیوم، اس سوال کو لے کر خاص طور پر کراچی پہنچے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان اجتماعات کے ساتھ جو توقعات وابستہ کر لی جاتی ہیں، ان کے پورا نہ ہونے کا ردِ عمل، بڑا ہمت شکن اور روح فرسا ہوتا ہے کہ مظلوموں کو اپنے مصائب کا حل کہیں سے نہیں ملتا اور قوم کی حالت سدھرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔ لیکن ان کانفرنسوں کی ناکامیوں کا ایک نتیجہ اور بھی ہے جو اس سے کہیں گہرا اور دور رس ہے۔ اور یہی وہ نتیجہ ہے جس کی وجہ سے ہم اس مسئلہ پر بار بار قلم اٹھانے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے ستمبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا — یہ آئینہ ہے — اس میں ہم نے تفصیل سے بتایا تھا کہ اس قسم کی ناکامیوں کے حقیقی اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا۔ کراچی کانفرنس کی ناکامی کے بعد، چونکہ ملک میں مایوسیاں ابھر کر فضا میں پھیل گئی ہیں اس لئے ہم نے اس موضوع کو پھر سے مرکزِ توجہ بنانے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ ہم نے اس مقالہ میں بتایا تھا کہ ہماری مایوسیوں کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم موجودہ مسلمانوں

سے ان نتائج کی امیدیں باندھ لیتے ہیں جن کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ جماعتِ مومنین یہ کچھ کر کے دکھائے گی' اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اس قسم کے نتائج محض مسلمان نام رکھانے والوں کے کاروبار سے مرتب نہیں ہو سکتے۔ ایسے نتائج ایمان سے مرتب ہوتے ہیں، اور ایمان محض مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے سے حاصل نہیں ہو جاتا۔ چونکہ ہم ان دونوں (موجودہ مسلمان اور قرآنی مومن) میں فرق نہیں کرتے، اس لئے، رفتہ رفتہ، غیر شعوری طور پر اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ اسلام میں اب اس کی صلاحیت ہی نہیں رہی کہ وہ اپنے دورِ اول کے سے درخشندہ نتائج پیدا کر سکے۔ نتیجہ یہ کہ ہماری ابھرنے والی نسل خود اسلام کی طرف سے مایوس ہو رہی ہے۔ ان نوجوانوں کے متعلق تو یہ کہہ دیا جائے گا کہ انہیں چونکہ حقیقی اسلام کے متعلق کچھ معلوم نہیں اس لئے یہ اس قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن یہ زہر ایسا ہے جس سے (مولانا) ابوالکلام آزاد جیسا "امام الہند" بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ دورِ الہلال کا ابوالکلام آزاد کہا کرتا تھا:

"پس اے عزیزانِ ملت! اور اے بقیہ ماتم زدگانِ قافلۂ اسلام!! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروانِ اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پیروئے توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان سات کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک حامئ وطن کے حلقِ بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرتے؛ ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعتِ نزع میں اشہد ان لا الٰہ الا اللہ کی آواز نکل رہی تھی تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج بلقان کے میدانوں میں حافظانِ کلمۂ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھن رہے ہیں تو ہم اللہ، اس کے ملائکہ اور اس کے رسولؐ کے آگے ملعون ہوں اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لئے بھی راحت اور سکون محسوس کریں، میں کیا کہہ رہا ہوں؟ حالانکہ اگر اسلام کی روح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیروؤں میں باقی ہے تو مجھ کو کہنا چاہیئے کہ اگر میدانِ جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان، مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے۔ کیونکہ ملتِ اسلام ایک

جسم واحد ہے۔ اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضاء و جوارح ہیں۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضاء کٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں ممکن نہیں کہ اس کے صدمے سے بے خبر رہیں۔ اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں محض اظہار مطلب کا زور بیان ہی نہیں ہے بلکہ عین ترجمہ ہے اس حدیث مشہور کا جس کو امام احمد و مسلم نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ جناب رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا۔

مثل الجسد، اذا اشتکی لہ عضو تداعی لہ سائر الجسد بالسهر والحمی (الحدیث)

مسلمانوں کی مثال باہمی مودت و مرحمت اور محبت و ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسم واحد کی۔ اگر اس کے ایک عضو میں کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو سارا جسم اس تکلیف میں شریک ہو جاتا ہے؛

اور اسی کے ہم معنی صحیحین کی وہ حدیث ہے جس کو ابو موسیٰ اشعریؓ نے روایت کیا ہے کہ

المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضا۔

ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایسا ہے جیسے کسی دیوار کی اینٹیں کہ ایک اینٹ دوسری اینٹ کو سہارا دیتی ہے؛

اور فی الحقیقت یہ خصائص مسلم میں سے ایک اولین اور اشرف ترین خصوصیت ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اپنے جامع و مانع الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۔ (۴۸ : ۲۹)

کافروں کے لئے نہایت سخت مگر آپس میں نہایت رحیم اور ہمدرد؛ ان میں جس قدر سختی ہے باطل اور کفر کے لئے۔ اور ان کی جس قدر محبت اور الفت ہے حق و صدق اور اسلام و توحید کے لئے۔

فاعتبروا یا ایها المسلمون ولا تکونوا کالذین قالوا سمعنا وهم لا یسمعون" (الہلال - ۱۱/۱۲ - ۶)

اور وہی ابوالکلام آزادؒ یہ کہتا ہوا دنیا سے رخصت ہوا کہ:

یہ سب سے بڑا فریب (FRAUD) ہے جس میں لوگوں کو مبتلا کیا جا رہا ہے

کہ دین کا رشتہ اُن خطوں کو متحد کر دے گا جو جغرافیائی، معاشی اور لسانی اور ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام نے ایک معاشرہ قائم کرنا چاہا تھا جو نسلی، لسانی، معاشی اور سیاسی حدود سے ماوراء ہو۔ لیکن تاریخ نے ثابت کر دیا کہ چند ہی سالوں کے بعد ـــــ یا زیادہ سے زیادہ ایک صدی کے بعد اسلام اس قابل نہ رہا کہ مسلمانوں کے مختلف ممالک کو محض اسلام کی بنیاد پر، ایک مملکت بنا سکے۔ (لہٰذا اب اس ناکام تجربہ کو دوبارہ دہرانا حماقت، یا فریب نہیں تو اور کیا ہے؟)

(INDIA WINS FREEDOM - P. 227)

اور یہی وہ تاثرات ہیں جو اس قسم کی کانفرنسوں کے ناکام تجارب ہماری نئی نسل کے دل پر منقوش کئے چلے جا رہے ہیں اور جن کے ازالہ کے لئے ہمیں اس موضوع پر بار بار قلم اٹھانا پڑتا ہے۔ دو لفظوں میں ہم واضح یہ کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ مسلمانوں کے اعمالِ حیات کا ذمہ دار اسلام کو نہ ٹھہرایئے آج ساٹھ ستر کروڑ مسلمان نام رکھانیوالی آبادی میں اسلام کہیں بھی نہیں ہے ـــ ہمارا اسلام سے اتنا ہی واسطہ ہے کہ ہم اس کی بدنامی کا موجب بنتے ہیں اور بس۔ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کی شہادت ہمارے ملک کے روزمرہ کے واقعات سے ملتی ہے۔ مثلاً

(۱) ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ مسلمان جھوٹ بولتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ (۳/۶۱) جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہے۔ تو کیا ہم مسلمانوں کی کذب بافی سے یہ نتیجہ اخذ کر لیں کہ اسلام جھوٹ بولنے کی تعلیم دیتا ہے؟

(۲) مسلمان ایک دوسرے کو فریب دیتے ہیں۔ تصنع، بناوٹ، چالبازی اور دھوکا دہی کی باتیں کرتے ہیں حالانکہ قرآن کا حکم ہے کہ اِجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲/۳۰) مکر و فریب کی بنائی ہوئی جھوٹی باتوں سے اجتناب کرو۔

(۳) قرآن کا حکم ہے کہ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا (۶/۱۵۳) ہمیشہ عدل و انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کرو۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا عمل اس کے یکسر خلاف ہوتا ہے۔ پھر اس کا ذمہ دار کون ہے؟

(۴) ارشاد خداوندی ہے کہ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ (۲/۴۲) نہ تو حق کو چھپاؤ اور نہ ہی حق و باطل کو گڈمڈ کرو ـــ اور ہم روز ایسا کرتے ہیں۔

(۵) قرآن کریم نے مومنین کا شعار یہ بتایا ہے کہ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ (۲۳/۳) وہ لغو باتوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں ـــ اور ہمارا سارا وقت لغویات میں گزر جاتا ہے۔ کیا اس کے ذمہ دار ہم ہیں یا اسلام؟

(۶) قرآن مجید نے کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ۔ (۲۴/۱۹) جو لوگ اسلامی معاشرہ میں بے حیائی کی باتیں پھیلانا پسند کرتے ہیں، انہیں اس دنیا میں بھی الم انگیز سزا ملنی چاہیئے اور آخرت میں بھی۔ آپ اس تعلیم کو دیکھئے اور پھر ایک نظر ڈالئے اپنے معاشرہ پر اور دیکھئے کہ ہمارے ہاں کوئی گلی، کوچہ، بازار، محفل، مجلس، تفریح گاہ، ایسی ہے جہاں فواحش کی تشہیر نہ ہوتی ہو؟

(۷) قرآن کریم نے خمر (شراب)، میسر (جوا) اور ہر وہ مال جو یونہی ہاتھ مار کر جھپٹ لیا جائے) اور انصاب وازلام (لاٹری اور قرعہ اندازی) کو رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ۔ (ناپاک، شیطانی افعال) قرار دے کر ان سے اجتناب کا حکم دیا ہے (۵/۹۰)۔ کیا مسلمان واقعی ان سے اجتناب برتتے ہیں؟ اور زنا کے متعلق کسے علم نہیں کہ قرآن کریم نے اسے کس قدر فعلِ شنیع قرار دیا ہے۔ اور ہمارے معاشرہ کی اس باب میں جو حالت ہے، اُسے بیان کرنے سے حیا مانع ہے۔

(۸) خدا کا حکم ہے کہ۔ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶) جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگ جایا کرو۔ یاد رکھو، تمہاری سماعت، بصارت اور قلب سے پوچھا جائے گا کہ جو بات تم نے سنی تھی اسے آگے پھیلانے سے پہلے تحقیق کر لیا تھا کہ واقعی صحیح ہے! آپ اس حکمِ خداوندی کو دیکھئے اور پھر ایک نظر ڈالئے اپنے معاشرہ، بالخصوص مسلمانوں کے اخبارات پر اور سوچئے کہ اس حکم پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے؟

(۹) قرآن نے کہا تھا کہ لَا تَجَسَّسُوْا (۴۹/۱۲) اس بات کی ٹوہ میں نہ لگے رہا کرو کہ کسی کی کوئی ناپسندیدہ بات ہاتھ آئے اور اس کی تشہیر کریں! اس حکم کو دیکھئے اور پھر اپنے معاشرہ پر غور کیجئے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟

(۱۰) اسلام کی تعلیم تھی کہ اَوْفُوْا بِالْعَھْدِ۔ اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۴) ہمیشہ وعدہ پورا کرو۔ تم سے اس کے متعلق باز پرس ہوگی (کہ تم نے وعدہ کر کے اسے پورا کیا تھا یا نہیں! اور اگر نہیں کیا تھا تو کیوں؟) اس حکمِ خداوندی کو دیکھئے اور پھر اپنے طرزِ عمل پر غور کیجئے۔ کیا ہمارا طرزِ عمل اس کے مطابق ہے۔

(۱۱) قرآن کریم نے کہا تھا کہ اَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ۔ (۱۷/۳۵) جب کوئی ماپ کرو تو ماپ پورا رکھو، اور جب تول کر دو تو تول پورا کرو۔ اس حکمِ خداوندی کو دیکھئے اور پھر موجودہ مسلمانوں کے بازار بیع و شریٰ پر نظر ڈالیئے۔ کیا آپ کو وہاں اس تعلیم کا شائبہ تک بھی دکھائی دیتا ہے۔ اَوْفُوا الْکَیْلَ۔ کے معنی یہ ہیں کہ خریدار سے جو کچھ لو اس کے بدلے میں اُسے اُس کی مطلوبہ شے خالص اور پوری پوری دو۔ کیا آپ کو مسلمانوں کے کسی بازار میں اپنے داموں کے عوض خالص اور پوری پوری شے ملتی ہے؟

(۱۲) ارشادِ باری تعالیٰ تھا کہ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (۵/۸)۔ ہمیشہ عدل کرو۔ کیوں کہ عدل کرنا تقوےٰ سے قریب تر ہے۔ سوچیے کہ ہمارے معاشرہ میں یہ جنسِ گراں مایہ کہیں سے بھی دستیاب ہوتی ہے؟ واضح رہے کہ عدل سے مراد صرف عدالتی عدل نہیں۔ عدالتی عدل تو عدل کی صرف ایک قسم ہے۔ عدل زندگی کے ہر گوشے میں مطلوب ہے۔ اور قرآن اس کا تقاضا ہر عبدِ مومن سے کرتا ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ "دشمن سے بھی عدل کرو" (۵/۸)۔ دشمن تو ایک طرف ہم دوستوں سے بھی عدل نہیں کرتے۔

(۱۳) عدل کی بنیاد سچی شہادت پر ہے۔ قرآن کریم کا اس باب میں ارشاد ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ۔ اے ایمان والو! انصاف کو ہر حال میں قائم رکھو۔ جب کسی معاملہ میں تمہاری شہادت مطلوب ہو تو تم مدعی یا مدعا علیہ کی طرف سے گواہی دینے کے لئے نہ جاؤ بلکہ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ۔ صرف اللہ کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ۔ اور پھر سچی سچی شہادت دو۔ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ۔ خواہ وہ شہادت خود تمہاری اپنی ذات کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ یا تمہارے والدین یا دیگر رشتہ داروں کے خلاف کیوں نہ ہو۔ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا۔ خواہ کوئی امیر ہو یا غریب، تم کسی کی طرف داری نہ کرو۔ فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا۔ ان کے مقابلہ میں خدا کا حق فائق ہے ـــ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا۔ یاد رکھو! ایسا نہ ہو کہ تمہارے جذبات کہیں سچی بات کہنے کے راستے میں حائل ہو جائیں۔ پھر اسے بھی سن رکھو کہ اِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا۔ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔ (۴/۱۳۵) گواہی دیتے وقت کوئی پیچ دار، ذو معنی بات نہ کہو۔ نہ ہی تم شہادت دینے سے پہلوتہی کرو۔ تم انسانوں سے تو ان باتوں کو چھپا سکتے ہو۔ لیکن خدا سے کسی بات کو چھپا نہیں سکتے۔ مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (۲۵/۷۲) وہ کبھی جھوٹی یا ملمع شدہ شہادت نہیں دیتے۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے، مومنین کی صفت۔ اسے سامنے رکھیے اور پھر کچہریوں میں جائیے جہاں (خدا کے فضل سے) سب مسلمان نظر آئیں گے ـــ اور یہ مسلمان، حلف اٹھا کر جو شہادت دیں گے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

سوچیے! کہ کیا مسلمانوں کے اس طرزِ عمل کے بعد انہیں مومن سمجھا جائے گا۔ اور ان کے اس طرزِ عمل کا ذمہ دار اسلام کو قرار دیا جائے گا۔

(۱۴) قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (۲/۱۸۸) ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ۔ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ۔ (۲/۱۸۸) نہ ہی حکام کو رشوت دے کر دوسروں کا حق غصب کرو۔

اس تعلیم کو دیکھو اور پھر اپنے معاشرہ پر نگاہ ڈالو، کیا اس سلسلہ میں کچھ کہنے کی ضرورت ہے ؟

(۱۵) قرآنِ کریم کا حکم ہے کہ کسی سے حسد مت کرو (۴/۵۴)، کسی کی غیبت نہ کرو (۴۹/۱۲)، دوسروں کے بُرے بُرے نام مت رکھو (۴۹/۱۱)، نہ ہی کسی کے خلاف یونہی کوئی عیب لگاؤ۔ کسی سے تمسخر مت کرو (۴۹/۱۱)، کسی کے سر بہتان مت باندھو (۴۹/۱۲)، کسی بے گناہ پر تہمت مت لگاؤ (۲۴/۲۳)، کسی کے متعلق بدگمانی سے کام نہ لو (۴۹/۱۲)، کہیں اسلام کے متعلق استہزا آمیز گفتگو ہوتی ہو تو وہاں سے اٹھ کر چلے جاؤ (۴/۱۴۰)۔

سوچیے، کہ مسلمان ان ہدایات پر کہاں تک عمل پیرا ہیں ؟

(۱۶) قرآن کریم نے کہا تھا کہ غصے کی حالت میں اپنے آپ پر ضبط رکھو اور عفو اور درگزر سے کام لو (۳/۱۳۳)۔ اس تلقین و تاکید کو سامنے رکھیے اور پھر دیکھیے کہ مسلمانوں کی آج کیا حالت ہے! جس طرح یہ بات بات پر بھڑک اٹھتے ہیں اور ذرا سے اشتعال دلانے پر جس انداز کی فساد انگیزیاں اور تخریب کاریاں شروع کر دیتے ہیں کیا قرآن پر ایمان رکھنے والوں کا یہ شیوہ ہو سکتا ہے ؟

(۱۷) قرآنِ کریم نے منافقین کے متعلق کہا تھا کہ یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (۳/۱۶۷)، ان لوگوں کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے اور زبان سے کچھ اور کہتے ہیں۔ سوچیے کہ اس قسم کے لوگوں کی تلاش میں ہمیں اپنے سے باہر کہیں جانے ضرورت ہے۔

(۱۸) دن بھر معاشرہ میں گھوم پھر کر شام کو گھروں کے اندر آجایئے اور وہاں دیکھیے کہ حالت کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے میاں بیوی کے تعلقات کے متعلق کہا تھا کہ ازدواجی زندگی سے مقصد یہ ہے۔ لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا۔ کہ گھر میں تمہیں سکون ملے۔ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً (۳۰/۲۱)، اور تم آپس میں انتہائی محبت اور ہم آہنگی سے رہو۔ سوچیے کہ ہم (مسلمانوں کے) گھروں میں کتنے ایسے ہیں جہاں زندگی کا یہ جنتی نقشہ نظر آتا ہے۔

(۱۹) قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ والدین سے، رشتہ داروں سے، ہمسایوں سے، حتیٰ کہ اپنے ماتحتوں تک سے حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ (۲/۱۵۲ ؛ ۱۷/۲۳ ؛ ۴/۳۶) اس نے کہا تھا کہ یتیموں کی (یعنی جو بھی معاشرہ میں تنہا رہ جائیں، ان کی) عزت کرو۔ ایسا نہ کرو گے تو خدا تمہیں ذلیل کر دے گا۔ (۸۹/۱۷)، سوچیے کہ کیا ہمارے ہاں ایسا ہوتا ہے ؟

(۲۰) قرآن نے کہا تھا کہ جن لوگوں کی ضروریاتِ زندگی ان کی محنت سے پوری نہ ہوتی ہوں، یا جو لوگ کام کرنے سے معذور ہو جائیں، تمہارے مال میں ان کا حق ہے (۵۱/۱۹)، سوچیے کہ کیا ہمارے معاشرہ میں اس کا انتظام ہے کہ ایسے لوگوں کی ضروریاتِ زندگی ان کے حق کے طور پر پوری کی جائیں ؟

(۲۱) آپ صبح اخبار کھولیے۔ اس کے ایک ایک صفحہ پر اس قسم کی خبریں ملیں گی کہ فلاں شخص نے

دو آنے کے جھگڑے پر اپنے ساتھی کے سینے میں چھرا گھونپ دیا اور مقتول دو چھوٹے بچوں اور بیوہ کو لاوارث چھوڑ کر چل بسا۔ فلاں بازار میں دو پارٹیوں میں تصادم ہو گیا، اور فریقین کے دس آدمی وہیں ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ فلاں شخص نے دن دہاڑے ایک راہ چلتی لڑکی کو اغوا کر لیا اور جس شخص نے اس معصوم کو بچانا چاہا، وہ غنڈہ اسے پستول کا نشانہ بنا کر، دندناتا ہوا چلا گیا۔

یہ اس قوم کا حال ہے جس کے خدا نے ان سے کہا تھا کہ انسانی جان اس قدر گراں بہا ہے کہ ۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا۔ یاد رکھو جس شخص نے کسی ایک شخص کو بھی قتل کر دیا ۔ بجز اس کے کہ اسے قتل یا بغاوت کے جرم میں سزائے موت دی گئی ہو ۔ تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری نوعِ انسان کو قتل کر دیا۔ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا (۵/۳۲) اور جس نے کسی ایک بے گناہ کی بھی جان بچا دی، اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کو زندگی عطا کر دی۔

قرآنِ کریم کی اس تعلیم کو سامنے رکھیے اور پھر مسلمانوں کے ہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر ایک نگاہ ڈالیے۔ بات واضح ہو جائے گی۔

(۲) اور اس سے بھی آگے بڑھیے، اور اخبارات میں پڑھیے اس قسم کی زہرگداز اور جگر سوز خبریں کہ (مثلاً) یمن اور سعودی عرب کی فوجوں میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔ یا سرحدات اور اردن کی افواج میں مسلسل جھڑپیں جاری ہیں جن سے دونوں کا کافی جانی نقصان ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان فوجوں میں، مرنے اور مارنے والے دونوں، مسلمان ہوتے ہیں۔ وہ مسلمان جن کے خدا نے کہا تھا کہ مَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا (۴/۹۳) جس کسی نے ایک مؤمن کو بھی عمداً قتل کر دیا تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اس پر خدا کا غضب، اور اس کی لعنت ہو گی۔ اس کے لئے خدا نے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

سوچئے کہ بات کہاں جا پہنچی ہے! مسلمان سے تو یہ کہا گیا تھا کہ جب دو مسلمان آپس میں ملیں تو ان میں سے ایک دوسرے سے کہے کہ السلام علیکم۔ میں تمہیں امن اور سلامتی کی ضمانت دیتا ہوں۔ تمہاری ہر طرح کی سلامتی کا میں ضامن ہوں (رسول اللہ کے ارشادِ گرامی کے مطابق) میرے ہاتھوں، تمہاری جان، مال، عزت، آبرو سب کچھ محفوظ رہے گا۔ اور مقابل سے دوسرا مسلمان کہے گا، کہ وعلیکم السلام ۔ اسی طرح میرے ہاتھوں بھی تمہارا سب کچھ محفوظ رہے گا۔

یہ تھی اسلام کی تعلیم ۔ اور وہ ہے مسلمانوں کا عمل۔ کہیئے کہ مسلمانوں کے اس عمل کی ذمہ داری اسلام پر عاید ہوتی ہے؟

جس مقصد کے لئے ہم نے اس قدر تفصیلی تمہید باندھی ہے، اب آپ اس کی طرف آیئے۔ آپ اس قسم کے مسلمانوں کو، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، ان کانفرنسوں میں اکٹھا کرتے ہیں، اور ان سے توقع یہ وابستہ کر لیتے ہیں کہ قرآن کریم نے جو کہا تھا کہ

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ۔ (۴۹/۱۰)

مومن سب آپس میں بھائی بھائی ہیں،

ان سے اس خصوصیت کا مظاہرہ ہوگا! یہ ہماری بھول ہے۔ خود فریبی ہے۔ قرآن نے یہ کچھ "مومنوں" کے متعلق کہا تھا، ہم مسلمان نام رکھانے والوں کے متعلق نہیں کہا تھا۔ مومنوں کے متعلق اس نے کہا تھا کہ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا (۳/۱۰۳) خدا نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا ہے اور یوں تم، اس کی اس نعمت کی بدولت، بھائی بھائی بن گئے ہو۔ ایک اجتماع ان لوگوں کا ہوتا تھا جن کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے تھے، اور ایک اجتماع ان لوگوں کا ہوتا ہے جن کے متعلق کہا ہے کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى (۵۹/۱۴)۔ ان کے ایک جگہ بیٹھنے سے تم خیال کرو گے کہ وہ اکٹھے ہو گئے ہیں، لیکن تمہیں اس کا علم نہیں کہ وہ بیٹھے بے شک یک جا ہیں، لیکن ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ یہ ہے نقشہ مسلم ممالک کی ان کانفرنسوں کا جن سے ہم اجتماعیتِ مومنین کے انسانیت ساز اور ملت پرور نتائج کی توقع وابستہ کر لیتے ہیں، اور ان کے پورا نہ ہونے سے مایوس ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یاد رکھیئے، جب تک ہم "مومن" اور موجودہ مسلمانوں میں فرق نہیں کرتے، یہ مایوسیاں بڑھتی چلی جائیں گی۔

ذرا سوچیئے، کہ ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ تمام دنیا کے مسلمان، رنگ، نسل، زبان، وطنی حدود و ثغور سے بلند و بالا ہو کر (پھر سے) ایک امت بن جائیں۔ اور کیفیت ہماری یہ ہے کہ ایک ملک (مثلاً پاکستان) میں بسنے والے مسلمان:

(ا) بنگالی، بلوچی، سندھی، پنجابی، سرحدی کی تفریقات میں بٹے ہوئے ہیں۔ یعنی ایک مملکت میں بسنے والے مسلمان بھی ایک قوم نہیں بن سکے۔

(ب) سیاسی طور پر ایک ہی نسل اور ایک ہی صوبہ کے مسلمان، بائیس پارٹیوں میں بٹ رہے ہیں اور تماشا یہ کہ ان میں سے ہر پارٹی، مملکت کو اسلامی بنانے کی دعوے دار ہے۔ اور

(ج) مذہبی طور پر ایک شہر، ایک گاؤں میں رہنے والے مسلمان، شیعہ، سُنّی، اہلحدیث، حنفی، دیوبندی بریلوی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، اور ان فرقوں کے علماء کرام، قرآن کریم کی ان آیات کی بھی تلاوت فرماتے رہتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ۔ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا

شِيَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ۔ (۳۰/۳۲)۔ (دیکھنا! تم ایمان لے آنے کے بعد پھر سے) مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن کر بیٹھ گئے۔ اس سے حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر گروہ سمجھتا ہے کہ میں حق پر ہوں اور باقی سب فرقے باطل پرست ہیں۔ اور وہ اس وعید کو بھی اپنے سامنے دیکھتے ہیں جس میں رسولؐ اللہ سے کہا گیا تھا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶/۱۵۹)۔ اے رسولؐ! جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں، تیرا ان سے کچھ تعلق واسطہ نہیں۔

سوچئے کہ جن مسلمانوں کی یہ حالت ہو کہ وہ ایک ملک، ایک شہر، ایک بستی، ایک محلہ، حتیٰ کہ ایک مسجد میں بھی ایک اُمت نہ بن سکیں، ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ رنگ، نسل، زبان، مملکت، وطن اور مذہبی فرقہ داری سے بلند ہو کر محض ایک کانفرنس ہال میں بیٹھ جانے سے اُمتِ واحدہ بن جائینگے، اور ساری دنیا کے مسلمانوں کو اپنے جگر کا ٹکڑا سمجھنے لگ جائیں گے، خوش فہمی اور خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن قصور ان کانفرنسوں میں شریک ہونے والوں کا نہیں۔ قصور ہمارا ہے جو "مسلمانوں" سے "مومنین" کی سی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ غالبؔ نے ایسے ہی مقام کے لئے کہا تھا کہ

ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

بلکہ اس سے بھی آگے (مومن کے الفاظ میں) کہ

مری اس سادگی پہ رحم کھانا کہ تم سے آرزوئے دل بیاں کی

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے کہا ہے کہ اس نے ان افراد (مومنین) کے دلوں کو باہم گرجوڑ دیا تھا، جس سے یہ اُمتِ واحدہ بن گئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ وجہِ جامعیت (CEMENTING FORCE) کونسی تھی جس سے ان میں اس قدر مودت اور اخوت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی وضاحت قرآنِ کریم نے یہ کہہ کر دی کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ... (۳/۱۰۳) ان کے قلوب کی ایسی حالت اعتصام بحبل اللہ سے ہوئی تھی۔ اور یہی وہ وجہِ جامعیت تھی جس سے ان کا تفرقہ مٹ گیا تھا ــــ اعتصام بحبل اللہ کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے خدا کی کتاب کا دامن مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ ان کا قرآنِ مجید پر محکم ایمان تھا۔ ایمان سے مراد کیا ہوتی ہے اور ایمان اور عمل کا باہمی تعلق کیا، اس کی وضاحت اُس مقالہ میں کی گئی ہے جو (اسی اشاعت میں) چند صفحات آگے چل کر آپ کے سامنے آئے گا جس کا عنوان ہے "مملکتِ اسلامی کیسے بنتی ہے"۔ اس سے آپ دیکھیں گے کہ ایمان نہ تو مردم شماری کے رجسٹر میں اپنا نام "مسلمان" لکھوانے کا نام ہے اور نہ ہی یہ محض چند الفاظ دہرا لینے سے حاصل ہوتا ہے۔ ایمان نام ہے صداقت کو علیٰ وجہ البصیرت، دل و دماغ کی کامل رضامندی سے قبول کرنے کا، اور اسکا

مظاہرہ ہمارے روزمرہ کے کردار سے ہوتا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ ہمارا ایمان قرآن پر نہیں ہے، اس لئے کہ (جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے) ہماری زندگی، وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، قرآنی احکام و تعلیمات کے خلاف ہے۔ لہٰذا جب ہم میں وہ وجہِ جامعیت ہی باقی نہیں رہی جس سے مسلمان اخوۃ (بھائی بھائی) بن سکتے ہیں، تو پھر ان سے اخوت کے خوشگوار نتائج کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے؟

اخوت سے نیچے اتر کر عصرِ حاضر میں، قومیت کا تصور افراد میں وجہِ جامعیت قرار پاتا ہے۔ قرآن کریم نے قومیت کی تشکیل کا معیار بھی ایمان ہی قرار دیا ہے۔ اس معیارِ قومیت کی بنا پر دنیا کے تمام مسلمان ایک قوم کے افراد قرار پاتے ہیں، لیکن چونکہ ہم میں یہ معیارِ قومیت بھی باقی نہیں رہا اس لئے دنیا کے مسلمان الگ الگ قوموں میں بٹ چکے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ہم (مسلمان نام رکھانے والی) مختلف اقوام کے نمائندوں کو ایک جگہ جمع کریں گے تو اس اجتماع کا نقشہ زیادہ سے زیادہ اقوامِ متحدہ (U.N.O.) جیسا ہوگا جس میں ہر قوم اپنے اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے کوشاں ہوتی ہے۔ نہ (U.N.O.) دنیا کے باشندوں کو ایک عالمگیر برادری بنا سکی ہے، نہ ہماری یہ کانفرنسیں، ستر کروڑ مسلمانوں کو ایک امت بنا سکتی ہیں۔

ایک ملک میں بسنے والے لوگ، ایک ضابطہ قوانین کی اطاعت سے ایک قوم بنتے ہیں لیکن مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ایک ہی مملکت میں، ان کے ضوابط قانون الگ الگ ہوتے ہیں۔ پہلے تو یہ اپنے ضابطہ قوانین کو دو شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں — یعنی شخصی قوانین اور ملکی قوانین — (یہ تقسیم خالص سیکولر نظامِ حکومت کی پیدا کردہ ہے اور اسلام کے یکسر خلاف) — اس میں ہر فرقے کا ضابطہ قوانین الگ الگ ہوتا ہے، اور جہاں تک ملکی قوانین کا تعلق ہے جن عناصر کو یہ قانون کی اساس قرار دیتے ہیں (یعنی روایات اور فقہ) ان کی بنا پر کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے لئے قابلِ قبول ہو (پاکستان میں قانون سازی کی کشتی تئیس سال سے اسی بھنور میں پھنسی چکر لگا رہی ہے) جب کسی ایک مملکت میں، مسلمانوں کے لئے متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا، تو کیا آپ توقع کر سکتے ہیں کہ (بہ حالاتِ موجودہ) مسلمانوں کی مختلف مملکتیں کسی ایک ضابطہ قوانین پر متفق ہو کر، امتِ واحدہ بن سکیں گی۔

قرآن کریم نے کہا تھا کہ دنیا میں دو ہی قومیں ہیں — ایک مومن اور دوسرے غیر مومن (کافر) اس تفریق و تقسیم کی بنیاد یہ تھی کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے۔ وہی کافر ہیں۔

یعنی اس کی رُو سے انسانوں کی تقسیم و تفریق کا اصولِ اساسی یہ ہے کہ جو لوگ اپنے معاملات کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کرتے ہیں (اسی کو حکومت قائم کرنا کہتے ہیں) وہ ایک قوم کے افراد ہیں ـــ یعنی امتِ مسلمہ، جماعتِ مومنین ـــ اور جو ایسا نہیں کرتے، وہ دوسری قوم کے افراد۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی کوئی مملکت بھی ایسی نہیں جس کی حکومت کی بنیاد ـــ قانون کی اساس ـــ قرآن مجید ہو۔ حتیٰ کہ جن مملکتوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے ہاں قانونِ شریعت رائج ہے، ان کے ہاں بھی قانون کی اساس کتاب اللہ نہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں سوچیے کہ مسلم ممالک کے جن نمائندوں کو ہم اس قسم کی کانفرنسوں میں جمع کرتے ہیں، ان میں کون سی قدر مشترک ہوتی ہے؟ ان میں نام (مسلمان) کے سوا کوئی مشترک قدر نہیں ہوتی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ صرف نام کا اشتراک کبھی وجہ جامعیت نہیں قرار پا سکتا۔ ہم روز دیکھتے ہیں کہ قاتل بھی مسلمان ہوتا ہے اور مقتول بھی۔ ظالم بھی مسلمان ہوتا ہے اور مظلوم بھی۔ مستغیث بھی مسلمان ہوتا ہے اور ملزم بھی ـــ لہٰذا جب یہ افراد محض مسلمان کہلانے سے بھائی بھائی نہیں بن سکتے، تو مختلف ممالک کے باشندے، محض مسلمان کہلانے سے کس طرح امتِ واحدہ بن سکتے ہیں۔ ان کے امتِ واحدہ بننے کی ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ کہ ان کا قرآن پر ایمان ہو جس کی عملی شہادت یہ ہو کہ ان کے قانونِ مملکت کی اساس قرآن ہو۔ جب تک ان کے آئین اور قانون کی اساس کتاب اللہ نہیں ہوگی، ان میں نہ وحدت پیدا ہو سکے گی نہ اخوت۔ اور جب ان میں ایمان کی بنا پر وحدت اور اخوت نہیں ہوگی، تو ان کی کانفرنسوں کا جذبۂ محرکہ اسلام نہیں ہوگا، کچھ اور ہوگا۔

جو حضرات وحدتِ امت کا جذبۂ صادقہ اپنے دل میں رکھتے ہیں، اور اس قسم کے اجتماعات سے صحیح اسلامی نتائج دیکھنے کے متمنی ہیں، ہم ان کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ پتوں پر پانی چھڑکنے کے بجائے، اپنی نگاہ جڑ پر رکھیں۔ جب تک جڑ کا رگ نہیں جائے گا، ان کی ہزار کوششوں کے باوجود یہ درخت سرسبز و شاداب نہیں ہو سکے گا۔ ان کی تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی اور اس کا نتیجہ مایوسی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ سوچیے، کہ جب ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ

(۱) ایک محلہ میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے سینے میں خنجر نہ گھونپے،

(۲) ایک مسجد میں اہلحدیث اور حنفی مولوی مل کر نماز پڑھ لیں،

(۳) اپنے ملک میں بنگالی، بلوچی، سندھی، پنجابی، سرحدی کے امتیازات مٹا دیں، اور

(۴) مملکتِ پاکستان کے لئے ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر دیں جسے تمام مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں،

جب ہم ایک مختصر سے خطۂ زمین میں اس قسم کی وحدت پیدا نہیں کر سکتے، تو ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک اُمّت

بنانے کی کوششیں کس طرح بارآور ہو سکیں گی۔ ان حضرات سے ہم گزارش کریں گے کہ وہ سردست "آل ورلڈ مسلم کانفرنسوں" کا خیال ملتوی کر کے، اس وحدت کی ابتداء اپنے اپنے گھروں سے کریں، اور دیکھیں کہ اس میں وہ کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر وہ سنّی اور شیعہ، یا حنفی اور اہلحدیث کو ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے، اور ایک ضابطۂ قوانین کو متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرنے میں کامیاب ہو جائیں، تو پھر انہیں اس سے آگے بڑھ کر بین الملّی وحدت کا خیال کرنا چاہیئے۔

پاکستان کی مملکت اسی مقصد کے لئے حاصل اور قائم کی گئی تھی کہ یہاں سے وحدتِ امت کا آغاز کر کے، اسے رفتہ رفتہ عالمگیر بنایا جائے۔ لیکن یہاں ہوا یہ کہ جس قدر وحدت تشکیلِ پاکستان کے وقت پیدا ہو گئی تھی، وہ بھی باقی نہیں رہی ـــ نہ صرف یہ کہ وہ باقی نہیں رہی، بلکہ اُس وقت اگر جسدِ ملّت چند ٹکڑوں میں منقسم تھا تو اب اس کا قیمہ ہو چکا ہے۔ ان حالات میں ہم، اہلِ پاکستان کا، مختلف مسلم ممالک کو دعوتِ اتحاد دینا، مضحکہ انگیز نہیں تو اور کیا ہے! اس وقت ہماری تاریخ پھر ایک نیا موڑ مڑ رہی ہے، اور ہمیں ایک بار پھر اس کا موقعہ ملا ہے کہ ـــ لوحِ دل پاک بشوئیم و زسر تازہ کنیم ـــ اگر ہم نے اپنے مجوزہ آئین میں یہ شق رکھ لی کہ پاکستان میں قانون کی اساس، خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہو گی، تو اس سے اس خطۂ پاک میں اُس وحدت کا بیج بویا جا سکے گا جو اسلام کا بنیادی مقصد تھا۔ لیکن اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یہاں انتشار و افتراق اور بڑھ جائے گا۔ اور جب ہم اپنی مملکت میں وحدتِ امت پیدا نہیں کر سکیں گے تو تمام عالمِ اسلام میں وحدت و جامعیت پیدا کرنے کا خیال ایک ایسا حسین خواب ہو گا جس کی تعبیر حسرت و یاس کے سوا کچھ نہیں ہو گی۔ اور ہماری کیفیت ان لوگوں سے کچھ بھی مختلف نہیں ہو گی جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ ہُمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا۔ (۱۸/۱۰۴)۔ وہ لوگ اس خیالِ خام میں مست رہے کہ ہم بڑی کاریگری سے کام لے رہے ہیں حالانکہ ان کی تمام کوششیں رائیگاں جا رہی تھیں ـــ اور اگر ان کانفرنسوں کا مقصد وحدتِ امت نہیں، کچھ اور ہے تو ہم اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں کہ

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو، حافظا، مخروش

اور اگر یہاں کی کامیاب سیاسی پارٹیاں، امت میں وحدت پیدا کرنے کے بجائے، اپنے اپنے اقتدار کے لئے ہی کوشاں ہیں اور ناکام جماعتیں ملک میں مزید انتشار پیدا کرنے کے لئے سرگرم سازش، تو ہم ان سے صرف اتنا کہیں گے کہ آپ جو کچھ آپ کے جی میں آئے کریں، لیکن خدا کے لئے اسلام کا نام درمیان میں نہ لائیں کہ اس سے دنیا کی نگاہوں میں اسلام رسوا ہو رہا ہے۔ اقبالؒ کے دردناک الفاظ میں ؎ تا نداری از محمدؐ رنگ و بو

از درودِ خود میالا نامِ اُو

(باقی)

نقد و نظر

ہومیوپیتھک لیڈر

ہومیوپیتھک طریقِ علاج کا ترجمان ماہنامہ، جو ہومیوپیتھک ڈاکٹر ایف۔ ایم۔ افضل کی زیرِ سرپرستی، پاپولر ہومیوپیتھک فارمیسی ۷۷ ٹیمپل روڈ، لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ پانچ روپیہ۔

علامہ اقبالؒ نے، عصرِ حاضر کے (مغربی تہذیب کے حامل) انسان کے متعلق کہا تھا کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا　　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

"افکار کی دنیا" تو بہت بلند اور عمیق ہے، انسان کی تو یہ کیفیت ہے کہ وہ ہنوز خود اپنے "جسم" کی دنیا میں بھی کماحقہ سفر نہیں کر سکا۔ وہ ابھی تک نہ تو حفظانِ صحت کے اصولوں کو بکمال و تمام دریافت کر سکا ہے اور نہ ہی تمام بیماریوں پر قابو پا سکا ہے۔ لیکن اس میں انسان کا بھی زیادہ قصور نہیں۔ قوانینِ فطرت کا انکشاف، انسانی مشاہدہ، مطالعہ اور تجربہ کی رُو سے ممکن ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس طریق سے حقیقت تک تدریجاً ہی پہنچا جا سکتا ہے۔ حفظانِ صحت اور ازالۂ امراض کے سلسلہ میں، انسان کی تدریجی کوششوں کی (اس وقت تک کی) آخری کڑی ہومیوپیتھک طریقِ علاج ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اصولی طور پر یہ طریق، حقیقت سے زیادہ قریب ہے۔ اس میں ہر مریض کو ایک مستقل بالذات فرد قرار دیا جاتا اور اس کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہمارے قدیم طریقِ علاج طبِّ یونانی میں جو "مزاج" کو اس قدر اہمیت دی جاتی ہے تو اس کی بنیاد بھی یہی تصور تھا)۔ انسان کی اسی انفرادیت کا نتیجہ ہے، کہ ہومیوپیتھک طریقِ علاج میں، نہ تو امراض کا کوئی نام ہے اور نہ ہی دو مریضوں کے لئے بالضرور ایک ہی دوائی تجویز کی جاتی ہے خواہ (بنظرِ بظاہر) ان کی شکایت مشترک ہی کیوں نہ ہو۔ اس میں ہر مریض کی کیفیت، مزاج، احساسات حتیٰ کہ نفسیات تک کا بغائر مطالعہ کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس کے لئے دوا تجویز کی جاتی ہے۔ اور دوا بھی بالضد نہیں بلکہ بالمثل۔

افسوس ہے کہ اس طریقِ علاج کو حکومتوں کی طرف سے وہ سرپرستی میسر نہ آئی جس کا یہ مستحق تھا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ مغربی دواساز کمپنیوں (یعنی ایلوپیتھک کی دواساز کمپنیوں) کا جذبۂ مفاد پرستی تھا۔ وہ کمپنیاں نہیں ریاستیں ہیں جو ساری دنیا کی دولت سمیٹ کر لئے جا رہی ہیں۔ غنیمت ہے کہ مملکتِ پاکستان نے اس طریقِ علاج کو مستند قرار دے دیا ہے، اور اس کی وجہ سے اسے کچھ فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ابھی بڑی کمی یہ ہے کہ اس کی تعلیم کیلئے حکومت

کیطرف سے کالج نہیں کھولے گئے جس کی وجہ سے عام طور پر حالت یہ ہے کہ ــــ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی ــ لیکن اس کا ذمہ دار یہ طریقِ علاج نہیں' قوم ہے۔

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر محمد افضل صاحب نے' جو لاہور کے ایک ممتاز ہومیو پیتھک معالج ہیں' زیرِ تبصرہ ماہنامہ کا اجرا فرمایا ہے۔ اس میں علاوہ دیگر معلومات' خود ڈاکٹر صاحب کے عملی معالجات کے لئے بھی ایک باب وقف ہے جو بڑی مفید معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ ماہنامہ عوام کے لئے بالعموم' اور ہومیو پیتھک طریقِ علاج سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بالخصوص' منفعت بخش ثابت ہوگا۔

رسالہ کی دسمبر کی اشاعت میں یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن' لاہور کی مجلسِ عاملہ نے قومی اسمبلی کے منتخب ارکان سے اپیل کی ہے کہ حکومت کے آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۵ء کو' جس کی رو سے' ہومیو پیتھی' یونانی اور آیورویدک طریقہ علاج کو ملک میں تسلیم کیا گیا تھا' منسوخ کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی سائنس' پروفیشن بن جائے تو اس میں اس قسم کی عصبیت پیدا ہو جاتی ہے جو حقیقت کو اپنے دائرہ تک محدود دیکھ لیتی ہے اور اس سے باہر ہر دعوے کو' بلا تحقیق و تدقیق' باطل قرار دے کر مسترد قرار دیدیتی ہے۔ یہ اندازِ نگاہ نہ عالمانہ ہے نہ محققانہ۔ اس سے سائنٹیفک ترقیاں رک جاتی ہیں بلکہ یوں کہیے کہ سائنس جامد مذہب بن کر رہ جاتی ہے۔ ہم میڈیکل ایسوسی ایشن سے درخواست کرینگے کہ وہ اپنی نگاہ میں کشادگی پیدا کریں' دیگر طرقِ علاج کا بغائر مطالعہ کریں اور ان میں جو مفید عناصر ہوں' ملک کو ان سے متمتع ہونے کی ترغیب دیں۔ یہ سب طریقہائے علاج' انسانی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ ان میں نہ تو کوئی طریق منزل من اللہ ہے کہ حق صرف اسی تک محدود ہو' اور نہ ہی کوئی مداریوں کا ہتھکنڈا کہ جسے یونہی جھٹکار دیا جائے۔

ضرورت رشتہ

ایک تیس سالہ کنوارے گریجویٹ نوجوان ۰۰۰۰۰ جس کی تنخواہ -/۴۲۵ روپے ماہوار ہے۔ اس کے لئے فکرِ قرآنی کا شائق رشتہ درکار ہے۔ ذات پات کی کوئی قید نہیں۔

(ملک) معرفت ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ

پھر ان کے بعد ہم نے تمہیں ملک کی حکومت عطا کی تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔

اسلامی مملکت کے

قرآنی آئین کے بنیادی اصول

ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قرآنی آئینِ مملکت کے بنیادی اصول

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ چلیپا را

مملکتِ پاکستان کی عمر کل تئیس سال کی ہے، اور تئیس ہی سال سے یہ اپنے آئین کی تلاش میں مارے مارے پھر رہی ہے۔ جس طرح اس مملکت کا، بغیر کسی جنگ وجدال کے حصول ایک نادر واقعہ تھا، اسی طرح ایک مملکت کا اپنی ساری عمر بے آئین رہنا بھی عدیم المثال سانحہ ہے۔ نو سال کے صبر آزما انتظار کے بعد ۱۹۵۶ء میں پہلا آئین مرتب اور نافذ ہوا تو دو ہی سال کے بعد اسے عسکری انقلاب کا سیلاب بہا کر لے گیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں دوسرا آئین نافذ ہوا تو اسے ۱۹۶۹ء کا جھکڑ اڑا کر لے گیا۔ اب پھر از سرِ نو وہی مرحلہ درپیش ہے۔

آئین سازی کا کام تو مجلس آئین ساز کا تھا، اور ہے، لیکن طلوعِ اسلام نے اپنے اوپر یہ فریضہ عائد کر رکھا ہے کہ وہ ہر پیش آمدہ معاملہ کے متعلق بتلائے کہ قرآن کریم ہمیں اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس سلسلہ میں طلوعِ اسلام نے اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس کیا اور ہر دور میں پکار پکار کر بتایا کہ جانبِ قبلہ کونسی راہ جاتی ہے۔ پہلی مجلسِ دستور ساز نے ۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد اور دیگر اصولات کے مسودات مرتب کئے تو طلوعِ اسلام نے (نومبر ۱۹۵۰ء میں) اپنی تنقیدات کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ اس نے دو سال کے بعد (نومبر ۱۹۵۲ء میں) "قرآنی دستورِ پاکستان" کے نام سے پہلا کتابچہ شائع کیا جو اس وقت تک آئین سازی کے سلسلہ میں اصولی رہنمائی کا کام دیتا ہے۔ پھر جب ۱۹۵۵ء میں، لاء کمیشن کا انعقاد عمل میں آیا تو ہم نے "اسلام میں قانون سازی کا اصول" کے عنوان سے (اردو اور انگریزی میں) دو کتابیں شائع کیں جو اس باب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے بعد جب عسکری حکومت نے آئینی کمیشن کی تشکیل کی تو ہم نے دو مبسوط پمفلٹ شائع کئے جن میں سے ایک کا عنوان تھا "اسلامی آئین کے بنیادی اصول" اور دوسرے کا "اسلامی مملکت میں قانونِ شریعت کس طرح مرتب ہوگا"۔ علاوہ ازیں طلوعِ اسلام کی قریب قریب ہر اشاعت میں اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ شائع

ہوتا رہا۔ اب جبکہ پھر آئین سازی کا مرحلہ درپیش ہے (صدرِ مملکت نے اعلان کیا ہے کہ نومنتخب شدہ مجلسِ آئین ساز کا اجلاس فروری ۱۹۷۱ء میں منعقد ہوگا) تو ہم نے ضروری سمجھا کہ ایک بار پھر واضح کیا جائے کہ اسلامی مملکت کے آئین کے سلسلے میں قرآن کریم کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اس ضمن میں دو بنیادی نکات کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

دو بنیادی نکات

(۱) قرآن کریم انسانی زندگی کے اہم مسائل کے متعلق اصولی راہنمائی دیتا ہے۔ اُنکی جزئیات متعین نہیں کرتا۔ یوں کہیے کہ وہ ایسی حدود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے امتِ مسلمہ اپنے اپنے زمانوں کے تقاضوں کے مطابق جزئی تفصیلات خود مرتب کرتی ہے۔ یہ اصول یا حدود غیر متبدل ہوتے ہیں اور ان کی بنیادوں پر مرتب کردہ جزئیات میں عند الضرورت ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۲) قرآن کریم کاروانِ انسانیت کے لئے ایک منتہیٰ مقرر کرتا ہے۔ اس کے سامنے ایک نصب العین رکھتا ہے، جس تک آہستہ آہستہ بتدریج پہنچا جا سکتا ہے۔ حضور نبی اکرم نے ایک ایسی امت کی تشکیل فرمائی جو قرآنی نصب العین پر دل کی گہرائیوں سے یقین رکھتی اور اس تک پہنچنا اپنا مقصودِ حیات سمجھتی تھی۔ ہماری حالت اس سے مختلف ہے۔ ہم نام تو وہی رکھتے ہیں جو اُس امت کا تھا لیکن ہمارا ایمان، ان کا سا ایمان نہیں اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کو خدا کی کتاب کہتے ہوئے بھی ہمارا عمل اس کے مطابق نہیں۔ بنا بریں، ہمارے لئے کشادگی راہ یہی ہوگی کہ قرآن کے مقرر کردہ منتہیٰ کو اپنے سامنے بطور نصب العین رکھیں اور پھر یہ طے کریں کہ جس مقام پر ہم اس وقت کھڑے ہیں، اس سے اس منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے کونسی تدریجی منازل اپنے لئے مقرر کریں۔ یوں یہ مملکت، رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ، بتدریج اسلامی بنتی جائے گی۔ یہ نہیں کہ ادھر اس نے قرار دادِ مقاصد پاس کی، اور ادھر ہم نے ڈھول بجانے شروع کر دیئے کہ مملکت اسلامی ہو گئی ہے۔

ان تمہیدی نکات کے بعد اب اُن اصولوں کی طرف آئیے جنہیں قرآن کریم نے اسلامی مملکت کے آئین کے لئے بطور حدود متعین کیا ہے۔ ہمارا فریضہ ان اصولوں کو سامنے لانا ہے۔ یہ کام مجلسِ آئین ساز کا ہوگا کہ وہ موجودہ حالات کے مطابق، ان اصولوں کی جزئیات مرتب کرے۔

(-)

۱۔ اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY)

اقتدارِ اعلیٰ سے مراد ہوتی ہے مملکت کی وہ اتھارٹی جس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہو، اور اس سے سرکشی، مملکت کے خلاف بغاوت قرار پائے۔ ملوکیت میں یہ اتھارٹی بادشاہ کی ذات ہوتی ہے۔ آمریت میں ڈکٹیٹر اور مغربی انداز جمہوریت میں عوام — قرآن کی رو سے یہ اتھارٹی نہ بادشاہ کو حاصل ہوتی ہے، نہ ڈکٹیٹر کو۔ نہ عوام کو حاصل ہوتی

سبِ نہ خواص) کو۔ یہ اقتدار صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے جس کا ارشاد ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) حق حکومت (آخری فیصلہ؛ حتمی کا حق) صرف خدا کو حاصل ہے۔ لَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (۱۸/۲۶) وہ اپنے اس حق میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ (۲۱/۲۳) اس کے کسی فیصلہ کو (Question) نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے نہیں پوچھا جا سکتا کہ اس نے فلاں قانون ایسا کیوں بنایا ہے۔ اس کے علاوہ ہر ایک کی تعادلی کو (QUESTION) کیا جا سکتا ہے۔

لیکن خدا تو نہ کسی کے سامنے آتا ہے اور نہ ہی ہم اس کی بات سن سکتے ہیں۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اس حقِ حکومت کی عملی شکل کیا ہوگی۔ اس کا جواب اس نے خود ہی دے دیا کہ خدا کی محکومیت اس کی کتاب کی اطاعت کے ذریعے اختیار کی جاتی ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۔ (۶/۱۱۵)

(اے رسولؐ) ان سے کہہ دو کہ کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم بنا لوں، درآنحالیکہ اس نے تمہاری طرف اپنی کتاب بھیجدی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

لہذا، اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومت میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کی کتاب کو حاصل ہوتا ہے اور ثانی الذکر میں، انسانوں کو ــــ خواہ وہ کوئی ایک فرد ہو، یا افراد کی جماعت ــــ یہی کفر اور اسلام کا امتیازی نشان ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)

جو کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے۔ وہی لوگ کافر ہیں۔

اسی لئے خود حضور نبی اکرمؐ سے، جنہوں نے سب سے پہلی اسلامی مملکت قائم کی تھی، کہا گیا کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)

تو ان میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کر۔

یہی وہ حقیقت کبریٰ ہے جسے قائداعظمؒ نے ان درخشندہ الفاظ میں پیش کیا تھا جنہیں ہم سو بار دہرا چکے ہیں اور شاید ابھی ہزار بار اور دہرانا پڑے، تاکہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں قائداعظمؒ کے تصور کے مطابق آئین مرتب کرنا چاہیئے، انہیں معلوم ہو جائے کہ اس باب میں قائداعظمؒ کا تصور درا بیان کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا۔

اسلامی حکومت کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔

اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی، اور نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

لہٰذا اسلامی مملکت کے آئین کی شق اول یہ ہونی چاہیئے کہ

اس مملکت میں اقتدارِ اعلےٰ خدا کو حاصل ہوگا جس کی عملی شکل یہ ہوگی کہ حکومت، خدا کی کتاب (قرآن مجید) کے احکام و اصولات کے مطابق قائم کی جائے گی اور اس کے خلاف کوئی قانون، حکم یا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

(۰)

۲۔ مجلسِ آئین و قوانین ساز کے حدود

قرآنِ کریم کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ

وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ... (۶/۱۱۵)

تیرے رب کی بات صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہوگئی۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

اس لئے سربراہِ مملکت ہو یا پارلیمان، قرآنی احکام و اصولات میں، نہ تو کوئی اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ کسی قسم کی تبدیلی۔ پارلیمان، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، مملکت کے لئے قانون بنا سکتی ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی مملکت کی "جمہوریت" لامحدود اور غیر مشروط نہیں ہو سکتی۔ یہ (CONTROLLED DEMOCRACY) ہوگی اور اس پر کنٹرول خدا کی کتاب کا ہوگا۔

لہٰذا اسلامی مملکت کے آئین کی دوسری شق یہ ہونی چاہیئے کہ،

مملکت کے قوانین کی اساس قرآنِ کریم ہوگی اور مجلسِ قوانین ساز، اس کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق، قانون مدوّن کرنے کی مجاز ہوگی۔ مملکت میں کوئی ایسا

قانون نافذ نہیں ہو سکیگا جو قرآنِ کریم کے خلاف ہو۔

مقامِ تشکر ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت نے اس حقیقت کو تسلیم کر کے کہ "کتاب و سنت" کے مطابق کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو پوری کی پوری امت کے لئے متفقہ طور پر اسلامی قرار پا سکے، قرآنِ کریم کے اساسِ قانون ہونے کی راہ ہموار کر دی ہے۔ یہی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی باہمی نزاع ختم کرنے اور اختلاف مٹانے کا صحیح طریق ہے۔

۴۔ فیصلہ کُن ادارہ

اس سلسلہ میں یہ سوال سامنے آئے گا کہ اس بات کا فیصلہ کس طرح کیا جائے گا کہ فلاں قانون قرآنِ مجید کے مطابق ہے یا نہیں۔ ۱۹۶۲ء کے آئین میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی رُو سے ایک اسلامی مشاورتی کونسل اور اس کے ذیل میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ کا انعقاد عمل میں لایا گیا تھا۔ ہم نے اسی زمانے میں کہہ دیا تھا کہ یہ سفید ہاتھی "محض دکھاوے کی ہنڈیاں" ہیں جن سے کوئی مفید مطلب نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔ سات آٹھ سال کے تجربہ نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ ادارے فی الحقیقت بیکار محض ہیں۔ انہیں ختم کر دینا چاہیئے اور ان کی جگہ ایک لاء کمیشن مقرر کر دینا چاہیئے جس کا فریضہ یہ ہو کہ وہ ملک کے مروجہ قوانین کو قرآن کے مطابق بنانے کی سفارشات کرے اور آئندہ بھی جو قانون زیرِ ترتیب آئے اسے قرآن کی روشنی میں پرکھ کر اپنی سفارش پیش کرے۔ لیکن اس بات کا آخری فیصلہ عدالتِ عالیہ کرے کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ بنابریں آئین کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے کہ

> اس آئین کے تابع ایک لاء کمیشن مقرر کیا جائے جو ملک کے مروجہ قوانین کا قرآن مجید کی روشنی میں جائزہ لے کر اپنی سفارشات پیش کرے۔ نیز جو قانون آئندہ بھی زیرِ تدوین آئے، وہ اس کے متعلق بھی قرآنی روشنی میں اپنی سفارش پیش کرے۔
>
> اس سوال کا فیصلہ کہ فلاں قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں مملکت کی عدالتِ عالیہ کریگی جس میں قانون سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بطور وکیل پیش ہو سکینگے۔

یاد رکھئے۔ امتِ مسلمہ میں مذہبی پیشوائیت کا تصور اور وجود غیر قرآنی ہے۔ اسلامی مملکت میں یہ فیصلہ کرنا کہ فلاں

معاملہ اسلام کے مطابق ہے یا نہیں، حکومت کے قائم کردہ ادارہ کا کام ہے ۔

۴۔ معیارِ قومیّت

اسلامی مملکت کا نظامِ حکومت، شورائیت پر مبنی ہوتا ہے۔ یعنی مملکت مشتمل ہوتی ہے پوری کی پوری امت پر اور اس کا کاروبار افرادِ امت کے باہمی مشورے سے طے پاتا ہے۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۳۸/۴۲) قرآن کا واضح ارشاد ہے۔ یعنی ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔ خود نبی اکرمؐ سے بھی کہا گیا تھا کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۹) امورِ مملکت میں تم ان سے مشورہ کیا کرو۔ قرآن نے صرف یہ اصول دیا ہے۔ اس مشاورت کی عملی شکل کیا ہوگی، اس کا تعین خود نہیں کیا کیونکہ عملی شکل مختلف زمانوں میں مختلف ہو سکتی ہے۔ ہماری ضروریات کے مطابق، اس کا تعین ہمیں خود کرنا چاہیئے۔

اس اصول میں قرآنِ کریم نے (بَيْنَهُمْ) کی جو شرط عاید کی ہے (یعنی افرادِ امت آپس میں مشورہ کریں) وہ بڑی اہم ہے اور دین میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی اسلام میں معیارِ قومیت ہے۔ ہم اس موضوع پر ۱۹۳۸ء سے لکھتے چلے آئے ہیں ـــــ اس لئے کہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد ہی اس دعوے پر تھی کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار ملک اور نسل کا اشتراک نہیں بلکہ دین کا اشتراک ہے، اور طلوعِ اسلام اس دعویٰ کو قرآن اور حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں بہ تکرار و اصرار پیش کر رہا تھا۔ اس معیارِ قومیت کے مطابق پاکستان کا وجود عمل میں آیا اس لئے اسے کسی صورت میں بھی مابہ النزاع نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن یہ امر باعثِ صد تاسف ہے کہ ان تئیس سال میں مملکت پاکستان کی اس اساسی حقیقت کو قطعیۃً نظر انداز کر دیا گیا اور اب یہ قریب قریب نسیاً منسیا ہو رہا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اسے ایک بار پھر ذرا تفصیل سے پیش کیا جائے۔

قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰/۱۹) تمام نوعِ انسان شروع میں امتِ واحدہ (ایک برادری) کی طرح تھے۔ پھر انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے۔ یہ اختلافات، رنگ، نسل، خون، زبان اور وطن کے اختلاف پر مبنی تھے۔ ان اختلافات کو مٹانے کے لئے خدا نے انبیاء کرامؑ کو بھیجنا شروع کیا۔ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (۲/۲۱۳)۔ اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ وہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرتے جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ اس سے واضح ہے کہ انسانوں کے باہمی اختلافات مٹانے کا ذریعہ خدا کی کتاب ہوتی تھی، یعنی وحیِ خداوندی ـــــ جو لوگ اس وحی کو ضابطۂ حیات تسلیم کرتے تھے وہ رنگ، نسل، خون، زبان، وطن

کے اختلاف سے بلند ہو کر ایک برادری بن جاتے تھے۔ جو اسے تسلیم نہیں کرتے تھے، وہ رنگ، نسل، خون، زبان، یا وطن کے اختلاف کو قائم رکھنے کی وجہ سے، دوسری قوم کے افراد قرار پاتے تھے۔ اس معیار کے مطابق، تمام نوعِ انسان اصولی طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ۔ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (۶۴:۲) اللہ وہ ہے جس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا۔ سو تم میں سے ایک گروہ ان کا ہے جنہیں کافر کہا جاتا ہے اور دوسرا گروہ ان کا جو مومن کہلاتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں "کافر" کا لفظ ایسے گھناؤنے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ یہ ایک طرح کی گالی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن نے اسے ان معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ اس نے اسے ان معنوں میں استعمال کیا ہے جن معنوں میں ہم آج (NON - MEMBERS) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا کے وہ تمام انسان جو ان اقدارِ انسانیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں جو وحی کی رُو سے ملے ہیں (اور جو اب قرآن کے اندر محفوظ ہیں) ایک گروہ، ایک جماعت، ایک قوم، ایک پارٹی کے ممبر ہیں۔ اور جو لوگ ان اقدار پر یقین نہیں رکھتے وہ اس پارٹی کے ممبر نہیں ہیں۔ یعنی وہ (NON - MEMBER) کافر ہیں۔ بہرحال یہ ہے قرآن کی رُو سے دنیا کے تمام انسانوں میں قومیت کی تقسیم کا معیار۔ اس کے نزدیک، دنیا میں قومیں صرف دو ہیں۔ مومنین کی قوم اور غیر مومنین کی قوم۔ وہ کہتا ہے کہ یہی وہ دو قومیں ہیں جن میں شروع سے باہمی نزاع و پیکار چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ جب وہ اس ضمن میں سب سے پہلی کشمکش کا ذکر کرتا ہے جو حضرت نوحؑ کے زمانے میں سامنے آئی تو وہ کہتا ہے کہ اس میں حضرت نوحؑ ایک طرف تھے

ازل سے تا امروز

اور ان کا حقیقی بیٹا دوسری طرف۔ جب حضرت نوحؑ اپنی قوم (جماعتِ مومنین) کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے لگے تو انہوں نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور کہا کہ ہمارے ساتھ آجا۔ وَ لَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِیْنَ (۱۱:۴۲) اور تو کافروں کے گروہ کے ساتھ نہ رہ۔ لیکن جب وہ اپنی روشِ زندگی کو بدلنے پر آمادہ نہ ہوا تو حضرت نوحؑ کا ہم وطن ہونا تو ایک طرف، ان کا بیٹا ہونا بھی اس کے کسی کام نہ آیا اور وہ اپنی پارٹی والوں کے ساتھ ہلاک ہو گیا۔ اور جب حضرت نوحؑ نے خیال کیا کہ وہ ان کے اپنے خاندان (اہل) میں سے تھا تو وحیِ خداوندی نے یہ کہہ کر اس کی صراحت کر دی کہ اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ (۱۱:۴۶) نہیں! وہ تیرے اہل میں سے نہیں تھا۔ اسی طرح جب حضرت ابراہیمؑ کے باپ نے اس صحیح روشِ زندگی کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو آپؑ نے نہ صرف باپ سے بلکہ پوری قوم سے یہ کہہ کر قطع تعلق کر لیا کہ وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۱۹:۴۸) میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو، ان سب سے الگ ہوتا ہوں۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ ان سے کہہ دیا کہ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ ہم تم سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو۔ ان سب سے یکسر بے تعلق ہیں۔ كَفَرْنَا بِكُمْ۔ ہم تم سے ہر رشتے

کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔ بَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا۔ تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی عداوت اور نفرت رہے گی۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو اور یہ عداوت محبت سے اور یہ نفرت رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر یقین کر لو جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے۔ حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ (‏[illegible]) اس لئے کہ اس عالمگیر اصولِ زندگی کی رُو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار خون یا وطن کا رشتہ نہیں۔ معیار یہ ہے کہ فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي (‏[illegible]) جو شخص اس راستے میں میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے ہے، اور میرے "اپنے" جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے غیر ہیں۔ یہی تھا وہ معیار جس کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ بھی اپنوں میں سے نہیں بلکہ غیروں میں سے تھی۔ اس لئے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوا (‏[illegible]) قومیت کی تقسیم و تفریق کا یہی معیار تھا جو نوعِ انسانی کی دعوتوں کے ساتھ ساتھ آگے چلتا چلا آیا۔ تا آنکہ دنیا کے سامنے وہ دور آگیا جب وحی کی تکمیل ہوگئی اور اس کے مطابق نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے ساری دنیا پر روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کہ قومیت

قومِ رسولِ ہاشمی

کا صحیح معیار کیا ہے۔ اس تشکیلِ قومیت کے مطابق حبش کا بلال، فارس کا سلمان، اور روم کا صہیب (رضی اللہ عنہم) محمد عربیؐ کی اپنی قوم کے افراد تھے اور مکہ کا ابوجہل اور (حقیقی چچا) ابولہب غیر قوم کے افراد۔ قومیت کی اسی تقسیم کا عملی مظاہرہ بدر کے میدان میں نکھر کر سامنے آگیا جب آسمان کی آنکھ نے یہ نظارہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے اور ان کا باپ عتبہ دوسری طرف۔ حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اُس طرف۔ حضرت علیؓ ادھر تھے تو ان کا بھائی عقیل اُدھر تھے۔ اور آگے بڑھیے۔ اِدھر خود محمدؐ تھے تو ان کے مدمقابل آپؐ کے حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص۔ یہ تھی وہ تقسیمِ انسانیت جو وطن، رنگ، زبان، نسل، رشتہ داری کے تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی۔ یہ تھی وہ امتِ محمدیہ۔ وہ ملتِ اسلامیہ، وہ جماعتِ مومنین جو دنیا کے مختلف حصوں کے ان انسانوں پر مشتمل تھی جن میں وجہِ اشتراک صرف ایمان تھا یہی تھی وہ تقسیم جس کے متعلق کہہ دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (‏[illegible]) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں۔ اور ان کے مقابلہ میں نہ ماننے والوں (کفار کی قوم) بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ (‏[illegible]) ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں۔ اس کے بعد اس قومِ مومنین کو تاکید کر دی کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ اے جماعتِ مومنین! تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔ اس لئے کہ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا۔ یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت

ہیں تم اچھے رہو۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ۔ ان کے بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آجاتی ہیں لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (۳/۱۱۷) ہم نے تمہیں واضح طور پر ان امور سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لوگے (تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے) ان نہ ماننے والوں کی حالت یہ ہے کہ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ۔ اگر کوئی بات تمہاری بھلائی کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں سخت رنج پہنچتا ہے۔ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا (۳/۱۱۹) اور اگر تمہیں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز ان کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے۔[1]

یہ ہے قرآن کی تعلیم مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات کی بابت۔ پھر چونکہ یہ قوم (مومنین) خانقاہ نشین راہبوں کی جماعت یا تارک الدنیا زاہدوں کا گروہ نہیں تھی بلکہ وہ قوم تھی جس کے دین کے متمکن (ESTABLISH) ہونے کے لئے حکومت لاینفک تھی (دیکھئے ۲۴/۵۵) اس لئے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تم نے اپنی حکومت میں تمام فیصلے احکامِ خداوندی کے مطابق کرنے ہیں فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ مومن نہیں کافر ہے (۵/۴۴)۔ قرآن کے ان اصولوں کی روشنی میں تمہیں جو قوانین مرتب کرنے پڑیں انہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشورے سے طے کیا کرو (وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۴۲/۳۸) ان میں کسی غیر کو شریک نہ کیا کرو۔ جو ان مستقل اقدار کی صداقت پر یقین ہی نہیں رکھتا وہ تمہارے امورِ مملکت میں شریک و دخیل کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آپ کو نہ رسول اللہ کی مجلسِ شوریٰ میں کوئی غیر مومن دکھائی دے گا نہ خلفاء راشدینؓ کی پارلیمان میں کوئی غیر مومن۔ ان کی حکومت خالصتہً جماعتِ مومنین پر مشتمل تھی اور غیر مسلم اس میں ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سر پر تھی۔

یہ تھا وہ معیارِ قومیت اور نظامِ حکومت جو قرآن نے مسلمانوں کو دیا تھا۔ اور اسی کے مطابق ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا[2]۔ یہ مطالبہ ہمارے عقیدہ کی بنیاد پر تھا، ہمارے دین کا جزو تھا۔ نہ اس میں کسی سودا بازی کا سوال تھا، نہ مفاہمت (COMPROMISE) کی کوئی گنجائش۔ دنیا اسے ہماری ضد کہتی تھی، ہم اسے اپنا ایمان قرار دیتے تھے اور یہی وہ ایمان تھا جس کی قوت سے ہم نے اپنا یہ مطالبہ دنیا سے منوا لیا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

---

[1] عدم گنجائش کے باعث یہاں صرف انہی آیات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مزید آیات کیلئے دیکھئے [illegible]

[2] اس اصول کے مطابق دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک قوم کے افراد ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم نے اس فراموش کردہ حقیقت کی تجدید کے لئے پہلے ایک خطہ کو منتخب کیا تاکہ اس خطہ میں اس حقیقت کو لباسِ مجاز میں لا کر دنیا کے باقی مسلمانوں کو بتایا جائے کہ دین کا منشاء یہ تھا۔ اب تم اس کی وسعتوں کو آگے پھیلاتے چلے جاؤ۔

آج جب ہمارے علمائے کرام، کسی پر کفر کا فتویٰ لگا کر کہتے ہیں کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو گیا تو اس کا کوئی عملی مفہوم سامنے نہیں آتا۔ ان فتووں کو کوئی (SERIOUSLY) لیتا ہی نہیں۔ اور جو (SERIOUSLY) لیتے بھی ہیں وہ بھی اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ قیامت کے دن جہنم رسید کئے جائیں گے۔ لیکن اسلامی مملکت میں اس کا عملی مفہوم ہوتا تھا۔ پہلے تو یہ کہ اس میں کوئی عالم یا مفتی اس کا مجاز نہیں ہوتا تھا کہ کسی کو مومن اور کسی کو کافر قرار دے۔ یہ اختیار صرف اسلامی مملکت کو حاصل ہوتا تھا۔ اور اس کی ایک آئینی حیثیت ہوتی تھی۔ وہ مملکت جسے کافر قرار دے، وہ مملکت سے متعلق کسی معاملہ میں شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے شریکِ حکم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آج کی اصطلاح میں یوں کہیئے کہ وہ آئینی طور پر (DISQUALIFY) اور (DISFRANCHISE) ہو جاتا تھا۔ (آج کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ) نہ وہ اسلامی پارلیمان کا ممبر بن سکتا تھا، نہ ان ممبروں کے انتخابات کے لئے ووٹ دے سکتا تھا، نہ مملکت سے متعلق امور میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا نہ ہی وہ کسی ایسی اسامی پر تعینات ہو سکتا تھا جس میں اس امر کا احتمال ہو کہ اس طرح اس کی رسائی رموزِ مملکت تک ہو جائے گی۔ مختصر الفاظ میں وہ اس مملکت میں بسنے والی مسلم قوم کا فرد شمار ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایسے لوگ (غیر مسلم) اس مملکت کے ذمی باشندے قرار پاتے تھے جن کی جان، مال، عصمت، عزت و آبرو، مذہب اور عبادت گاہوں کی حفاظت کا ذمہ اسلامی مملکت لیتی تھی۔ اور انہیں وہ تمام مراعات دیتی تھی جو انسان ہونے کی حیثیت سے قرآن کی رو سے ہر ابنِ آدم کو حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن وہ شریکِ امورِ مملکت نہیں ہو سکتے تھے۔

یہ ہے وہ دو قومی نظریہ جو دین کا اساسی رکن ہے اور جس پر مملکتِ پاکستان کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت کے آئین میں اس کی صراحت ہونی چاہیئے کہ

> مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، مسلم قوم کا جزو نہیں قرار پا سکتے۔ اس لئے انہیں امورِ مملکت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ نہ وہ اس کی پارلیمان کے ممبر ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان ممبروں کے انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں۔ نیز وہ مملکت کی ان اسامیوں پر بھی تعینات نہیں کئے جا سکتے جن کا تعلق رموزِ مملکت سے ہو۔ انہیں صرف وہ مراعات حاصل ہوں گی جن کی تشریح آئین کی شق ۔۔ میں کی گئی ہے۔

یاد رکھیئے، جس آئین میں یہ شق موجود نہ ہو نہ وہ آئین اسلامی کہلا سکتا ہے اور نہ ہی وہ مملکت اسلامی ہو سکتی ہے جس میں وہ آئین نافذ ہو۔ قرآن اس باب میں کسی قسم کی مفاہمت کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ دین کے بنیادی

اصولوں میں سند ہے ...... وَ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔

---(۰)---

۵- مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں

قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ انسانوں کے اختلافات مٹانے کا ذریعہ "کتاب" قرار دیا گیا ہے، تو آپ نے غور فرمایا ہے کہ اس کا عملی مفہوم کیا ہے؟ کتاب کے معنی ضابطۂ قوانین کے ہیں۔ ایک ملک میں بسنے والے افراد ایک قوم اسی صورت میں بنتے ہیں جب وہ ایک ضابطۂ قوانین کی اطاعت کریں۔ بالفاظِ دیگر، قوم کی وحدت کا انحصار قانون کی وحدت پر ہوتا ہے۔ اگر کسی قوم کے مختلف گروہ مختلف قوانین کے تابع زندگی بسر کریں، تو ان میں کبھی وحدت نہیں پیدا ہو سکتی۔ امتِ مسلمہ بھی امتِ واحدہ اسی صورت میں بن سکتی ہے جب وہ ایک ضابطۂ قوانین کے تابع رہے۔ اور چونکہ تمام مسلمانوں کے لئے ایک ہی ضابطۂ قوانین (قرآن مجید) کی اطاعت لازم قرار دی گئی ہے اس لئے ان میں تفرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں نہ تو شخصی (PERSONAL LAWS) اور مدنی قوانین (PUBLIC LAWS) کی تفریق کی گئی ہے اور نہ ہی اس میں مختلف فرقوں کے لئے مختلف فقہوں کا کوئی تصور ہے۔ امت میں فرقوں کا وجود اس کی نصِ صریح کی رُو سے شرک ہے (۳۰/۳۲) اور چونکہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی ثنویت نہیں، اس لئے جس طرح مذہبی فرقوں کا وجود از روئے قرآن شرک ہے، اسی طرح سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی یکسر خلافِ اسلام۔ قرآن نے اسے سیاستِ فرعون سے تعبیر کیا ہے (۲۸/۴)۔ ہمیں تسلیم ہے کہ بہ حالاتِ موجودہ مذہبی فرقہ بندی کے شرک کو بیک جنبشِ قلم نہیں مٹایا جا سکتا، لیکن سیاسی پارٹیوں کو تو از روئے قانون فوراً ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ حالیہ جھگڑے کے نتیجہ میں ملک میں مؤثر سیاسی پارٹیاں صرف دو رہ گئی ہیں۔ اس سے اگلا قدم وحدتِ امت کا ہو سکتا ہے جس میں پارٹی کوئی بھی نہ رہے۔ جہاں تک مذہبی فرقوں کا تعلق ہے، اگر

(۱) قرآن کی اساس پر ملک کا قانون مرتب کیا جائے تو اس کا اطلاق مملکت کے تمام مسلمان باشندوں پر یکساں طور پر ہو سکیگا۔ اس سے فرقہ بندی کی گرہیں خود بخود ڈھیلی پڑ جائینگی۔

(۲) تعلیم کا انتظام اس طرح سے کیا جائے کہ مذہبی اور سیکولر تعلیم کی موجودہ غیر اسلامی ثنویت ختم کر کے سب بچوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے اُن میں عام دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن کی بلند اقدار کا شعور بھی پیدا ہوتا چلا جائے۔ اس طرح اُن کے دل و دماغ سے فرقہ وارانہ امتیازات کی لکیریں خود بخود مٹتی چلی جائیں۔

لہٰذا ہمارے مجوزہ آئین کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے کہ

۱۔ قرآن کی اساس پر مملکت کیلئے جو قانون مرتب کیا جائیگا اسکا اطلاق ملک کے تمام مسلمان باشندوں پر یکساں ہوگا۔
۲۔ سیاسی پارٹیوں کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا جائے گا۔

(۰)

۶۔ بین الملی تعلقات

دین کے اشتراک پر قومیت کی تشکیل کے یہ معنی نہیں کہ کسی ایک ملک میں بسنے والے مسلمان غیر مسلموں سے الگ، ایک جداگانہ قوم کے افراد قرار پاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے (اور قرآن کا درحقیقت منشا بھی یہی تھا) کہ دین کے رشتہ میں منسلک افراد کو خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں بھی بستے ہوں، ایک قوم کے افراد قرار پائینگے۔ امتِ واحدہ دنیا میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر مشتمل ہوتی ہے نہ کہ کسی خاص خطۂ زمین میں بسنے والے مسلمانوں پر۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو دیگر ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے ساتھ ہمارے تعلقات کی بنیاد نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ انتظامی نقطۂ نگاہ سے کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں بسنے والے مسلمانوں کی الگ الگ حکومتیں ہو سکتی ہیں لیکن وہ الگ الگ اقوام میں نہیں بٹ سکتے۔ لہٰذا قرآنی نقطۂ نگاہ سے جہاں پوری مملکت کی سالمیت اور وحدت اسلام کا بنیادی تقاضا ہے اُس کے ساتھ ہی دیگر ممالک میں بسنے والے مسلمانوں سے اس قسم کے تعلقات جیسے ایک قوم کے افراد میں ہوتے ہیں، دین کی لازمی شرط ہے۔ بنابریں قرآنی دستور پاکستان کی ایک شق یہ بھی ہونی چاہیئے کہ

دین کے اشتراک کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا فطری اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ مختلف ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک قوم کے افراد تسلیم کیا جائے۔ دیگر مسلم ممالک کیساتھ ہمارے تعلقات کی بنیاد قرآن کا یہی اساسی اصول ہوگا۔

(۰)

۷۔ نظامِ حکومت

ہم نے اوپر کہا ہے کہ قرآن کی رُو سے، ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں، لیکن ہم نے پاکستان میں ایسا نظام رائج کر رکھا ہے جس کی وجہ سے خود پاکستان میں بسنے والے مسلمان بھی ایک قوم نہیں بن سکے۔ ہم نے پہلے ملک کو دو بازوؤں میں تقسیم کیا اور اب مغربی بازو کو چار ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔

یہ تقسیم اگر محض انتظامی مقاصد کے لئے ہوتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن ہم نے ان خطوں میں الگ الگ مفادات کی ایسی دیواریں کھڑی کر دیں جن سے یہ قوم مختلف اقوام میں تقسیم ہو گئی اور وہ بھی ایسی اقوام جن میں باہمی رقابت، عصبیت اور نفرت کے جذبات تیز سے تیز تر ہوتے چلے جائیں۔ ہم نے ان خطوں میں بسنے والوں کے لئے ملازمتوں میں جداگانہ تناسب مقرر کیا اور پارلیمان میں نشستوں کی تقسیم بھی اسی نسبت سے کر دی۔ یہ تقسیم باہمی مفادات میں ایسے مستقل تصادم کا موجب بن گئی جس سے نہ صرف ناخن گوشت سے الگ ہو گیا بلکہ بھائی بھائی کا دشمن ہو گیا۔ جب غیر منقسم ہندوستان میں مسلم لیگ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کے لئے آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ملازمتوں میں اسامیاں مخصوص کر دی جائیں تو اس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ ہمیں "روٹیاں بانٹنے" کے مطالبات کی پست سطح پر نہیں اترنا چاہیئے۔ اس کے جواب میں کہا گیا تھا کہ یہ سوال روٹیاں بانٹنے کا نہیں، ملازمتوں اور پارلیمانی نشستوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان میں جداگانہ قومیت کا احساس ہر وقت بیدار رہیگا اور یہ آپس میں کبھی مل نہیں سکیں گے۔ جداگانہ قومیت کا یہی وہ احساس تھا جو تقسیم ملک پر منتج ہوا۔ ملازمتوں اور پارلیمان کی نشستوں میں جداگانہ نیابت کا جو نتیجہ ہندوستان میں برآمد ہوا تھا، وہی نتیجہ یہاں مرتب ہوا۔ اس سے باہمی رقابت کے ایسے جذبات بیدار ہوئے کہ ہر خطہ میں بسنے والا مسلمان اپنے آپ کو دوسرے خطوں میں بسنے والوں سے ایک الگ وحدت محسوس کرنے لگ گیا۔ اگر یہی صورتِ حالات باقی رہی تو پاکستان کے مسلمان کبھی ایک قوم کے رشتہ میں منسلک نہیں ہو سکیں گے اور مفاداتِ باہمی کے تصادم کی خلیج بڑھتے بڑھتے معلوم نہیں کہاں تک لے جائے گی۔ ان خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے نظامِ حکومت میں بنیادی تبدیلی کی جائے۔ پورے پاکستان میں وحدانی انداز (UNITARY-FORM) کی حکومت قائم کی جائے جس میں مختلف علاقوں کی آبادی کی کوئی تخصیص نہ ہو اور انتظامی مقاصد کے لئے ملک کو ضلعوں اور کمشنریوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ نہ کوئی صوبہ الگ ہو نہ اس کی پارلیمان جداگانہ۔ ملازمتوں کی اسامیاں جوہرِ ذاتی کے معیار پر پُر کی جائیں اور تعلیم کا ایسا انتظام کیا جائے جس سے بنگالی، بلوچی، سندھی، پنجابی، افغانی کے امتیازات مٹ کر، قوم امتِ واحدہ کے قالب میں ڈھل جائے۔ اس کے سوا ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔

(۰)

۸۔ تشکیلِ حکومت

قرآنِ کریم حکومت کی شکل (FORM OF GOVERNMENT) سے بحث نہیں کرتا۔ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑتا ہے کہ وہ اپنے حالات کے مطابق جس قسم کی شکل چاہیں متعین کر لیں۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ صدارتی

نظامِ قرآنی تصورِ مملکت کے زیادہ قریب ہے۔ اس میں امورِ مملکت سے متعلق فیصلوں کی ذمہ داری ایک فرد پر مرکوز ہو جاتی ہے جس سے باز پرس اور مواخذہ کیا جا سکتا ہے۔ پارلیمانی نظامِ جمہوریت میں کوئی فرد کسی فیصلہ کا ذمہ دار، لہٰذا مسئول قرار ہی نہیں پاتا۔ واضح ہے کہ اسلامی مملکت میں سربراہِ مملکت ڈکٹیٹر نہیں ہوتا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اسلام میں آمریت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جب سربراہِ مملکت ان حدود میں گھر جاتا ہے جو قرآن نے متعین کی ہیں تو اس کی آمریت ختم ہو جاتی ہے۔

اسلامی مملکت کی پارلیمان میں حزبِ اختلاف کا وجود نہیں ہوتا۔ غیر مسلم تو پارلیمان کے ممبر نہیں ہو سکتے اور مسلمانوں کا دو ایسی پارٹیوں میں تقسیم ہو جانا جن میں سے ایک پارٹی کا منصب ہی دوسری پارٹی سے برسرِ پیکار رہنا ہو، اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کی رُو سے پارٹیاں دنیا میں دو ہی ہیں — ایک حزب اللہ اور دوسری حزب الشیطان — یعنی ایک حضورؐ کی مجلسِ مشاورت اور دوسرا ابوجہل اور ابولہب کا ندوہ۔ حضورؐ کی مجلسِ مشاورت کا مخالف اور موافق گروہوں میں بٹے رہنا، قرآنی تصریحات کی نقیض تھا۔ باہمی مشاورت میں اختلافِ رائے کا سوال دوسرا ہے۔ لیکن امت کا مستقل طور پر دو گروہوں میں بٹ جانا، یکسر غیر اسلامی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حزبِ مخالف کے بغیر جمہوری نظام قابلِ عمل نہیں ہوتا۔ اور ہم کہتے ہیں کہ جہنم میں جائے وہ نظام جس کا لازمی نتیجہ امت کا مخالف اور متحارب گروہوں میں بٹے رہنا ہو۔

قوم میں بہرحال عام علمی اور ذہنی سطح کے افراد بھی ہوں گے اور خاص صلاحیتوں کے مالک افراد بھی۔ مجلسِ مشاورت میں ان دونوں کی نمائندگی ضروری ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے پارلیمان کا دو ایوانوں پر مشتمل ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا آئین کی اگلی شق یہ ہونی چاہیئے کہ:

> پارلیمان دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی۔ ایک ایوانِ عام ابنائے ملت پر مشتمل اور دوسرا خاص صلاحیتوں کے اہلِ اعیانِ امت پر۔
>
> پارلیمان کے ایوانوں میں پارٹیوں کا وجود قانوناً ممنوع ہوگا۔ تمام امور باہمی مشاورت سے طے ہوں گے اور حزبِ موافق اور حزبِ مخالف کا غیر اسلامی تصور کارفرما نہیں ہوگا۔

۸۔ الف۔ اصولِ اہلیت

ذمہ داریاں سونپنے کے سلسلہ میں قرآن کریم نے اصول یہ مقرر کیا ہے کہ۔ اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ اَنْ

تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ..... (۴/۵۸) اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ جو امانتیں تمہیں بطور امانت دیئے گئے ہیں انہیں ان کے سپرد کرو جو ان کے اہل ہوں۔ اس "اہلیت" میں علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے علاوہ، سیرت و کردار کی پاکیزگی بنیادی شرط ہے کیونکہ قرآن کی رُو سے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے۔ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل ہوں اور وہ اپنے جذبات و خیالات کے پیچھے لگ جائیں ان کا حکم نہیں مانا جائے گا۔ سورۂ کہف میں ہے۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۔ (۱۸/۲۸)

تم اس کی اطاعت مت کرو جس کا دل قوانینِ خداوندی کی طرف سے غافل ہو گیا اور اس نے اپنی خواہشات کا اتباع شروع کر دیا اور اس طرح اس کا معاملہ حد سے بڑھ گیا۔

قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۔ (۱۱/۴۶) جس کا عمل غیر صالح ہو بایں وہ تمہارے اہل میں سے نہیں رہتا۔ لہٰذا مملکت کے افسرانِ ماتحت سے لے کر صدارتِ عظمیٰ تک، اہلیت، صالحیت اور تقویٰ (پاکیزگیٔ سیرت) کی شرائط ہر ایک پر عاید ہوں گی اور معاشرہ میں مدارجِ جوہرِ ذاتی اور حسنِ کردار کی رُو سے متعین کئے جائیں گے۔ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹) ارشادِ خداوندی ہے۔ لہٰذا آئینِ مملکت کی ایک شق یہ ہونی چاہیئے کہ

صدرِ مملکت، اس کی مجلسِ شوریٰ کے ارکان (کیبنٹ) ارکانِ مجالسِ مقننہ (پارلیمان) اربابِ نظم و نسق، افسرانِ ماتحت اور ان دیگر افراد پر جو کسی نہ کسی انداز سے امورِ مملکت کی سرانجام دہی سے متعلق ہوں، حسبِ ذیل شرائط کا اطلاق ہوگا۔

(۱) قرآنِ کریم کے اصول و احکام سے واقفیت۔

(۲) متعلقہ امور کی سرانجام دہی کی بحسن و خوبی اہلیت

(۳) صالحیت یعنی سیرت و کردار کی پاکیزگی۔

(۴) ذاتی مفادات و جذبات سے بلند ہو کر معاملات کی سرانجام دہی کی صلاحیت۔

اگر کوئی شخص کسی وقت ان شرائط میں سے کسی ایک شرط پر پورا نہ اترے تو جس طریق سے اس کا انتخاب یا تقرر عمل میں آیا تھا اسی طریق سے اسے معطل یا برطرف کیا جا سکتا ہے۔

(۰)

۸۔(ب)۔ نظامِ تعلیم

قوم کا مدار بڑھنے پھولنے چلنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت پر ہے اور یہ اسلامی مملکت کا بنیادی فریضہ ہے۔ اس فریضہ کی رُو سے، بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری ان کے والدین کے سر پر نہیں ہوگی بلکہ یہ حکومت کی اجتماعی ذمہ داری ہوگی۔ وہ مختلف مدارج پر بچوں کو چلنے میں چھانتی چلی جائے گی اور ہر بچے کی مزید تعلیم کا انتظام اس کی ذہنی افتاد اور طبعی رجحان کے مطابق کرتی جائے گی۔

نظامِ تعلیم میں مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ غیر اسلامی تفریق ختم کر دی جائے گی جس کی رُو سے الگ مذہبی درسگاہوں کی ضرورت نہیں رہے گی۔ طالب علموں کو علومِ عصرِ حاضر کی تعلیم اس انداز سے دی جائے گی کہ وہ جو مضمون بھی پڑھیں اس میں دیکھ سکیں کہ قرآنِ مجید اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔ ان کی تعلیم

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

کی عملی مثال پیش کرے۔ اس کے لئے ظاہر ہے کہ عربی زبان کی تعلیم لازمی ہوگی۔ بنا بریں، قرآنی آئین کی ایک شق یہ ہونی چاہیئے کہ

قوم کے بچوں کی (اول سے آخر تک) تعلیم کی ذمہ داری انفرادی طور پر والدین کی نہیں، بلکہ اجتماعی طور پر حکومت کی ہوگی۔ نظامِ تعلیم میں مذہبی اور دنیاوی تعلیم کی موجودہ تفریق کو ختم کر دیا جائے گا اور طالب علموں کو دنیاوی علوم کی تعلیم اس طرح دی جائے گی کہ وہ ہر شعبہ میں یہ جانچنے کے قابل ہو سکیں کہ قرآنِ کریم اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔

(۰)

۹۔ عدلیہ

اسلامی مملکت کا پورا نظام عدل کے محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ عدل میں عمرانی عدل بھی شامل ہے اور قانونی

عدل بھی۔ جہاں تک عدلِ عمرانی کا تعلق ہے، قرآن کے اصولات یہ ہیں کہ

(۱) تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم سمجھا جائے۔

(۲) ہر ایک کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں ذرائع اور مواقع بہم پہنچائے جائیں۔

(۳) معاشرہ میں ہر ایک کی پوزیشن ذاتی صلاحیتوں کی رُو سے متعین کی جائے۔

(۴) ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق ذمہ داری سونپی جائے۔

(۵) بنیادی حقوقِ انسانیت کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہوں۔

لہٰذا کوئی ایسا قانون یا طریقِ عمل جس کی رُو سے پیدائشی نسبت کے اعتبار سے انسان اور انسان میں فرق کیا جائے غیر قرآنی اور غیر آئینی متصور ہوگا۔ واضح رہے کہ امورِ مملکت کے سلسلہ میں مسلم اور غیر مسلم کے سلسلہ میں جو امتیاز کیا جاتا ہے، وہ اس اعتبار سے نہیں ہوتا کہ ایک شخص غیر مسلموں کے گھر پیدا کیوں ہو گیا ہے — پیدائش کے اعتبار سے تو نہ کوئی مومن ہوتا ہے نہ کافر — یہ امتیاز اس لئے روا رکھا جاتا ہے کہ غیر مسلم اس آئیڈیالوجی کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتا جس پر اسلامی مملکت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ جو مملکت بھی کسی آئیڈیالوجی کی بنا پر قائم ہوگی اس میں ان لوگوں کو شریکِ حکم نہیں کیا جا سکتا جو اس آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کریں۔

جہاں تک قانونی عدل کا تعلق ہے، عدل کی تعریف (DEFINITION) یہ کی جاتی ہے کہ متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ قانون کی رُو سے کیا جائے۔ یہ درست ہے لیکن قرآن اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر خود قانون ہی مبنی بر عدل نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جائے گا۔ اور اس کے نزدیک قانون کے مبنی بر عدل ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ خدا کی مقرر کردہ حدود کے مطابق ہو۔ اس لئے اس نے عدل کی شرط یہ قرار دی ہے کہ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (۷/۱۸۱)۔ الحق کے مطابق عدل کیا جائے۔ اور الحق سے مراد وحیٔ خداوندی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے یہ تجویز کیا ہے کہ مملکت کی عدالتِ عالیہ اس امر کا فیصلہ کرے کہ ملک میں نافذ ہونے والا قانون قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ یعنی بجائے اس کے کہ ملک میں ایک غلط (خلافِ قرآن) قانون نافذ ہو جائے اور بعد میں اسے عدالتوں میں چیلنج کیا جائے، یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ عدالتِ عالیہ پہلے ہی یہ دیکھ لے کہ مجوزہ قانون خلافِ قرآن نہیں۔ ہم نے اس مقصد کے لئے "عدالتِ عالیہ" کو اس لئے قاضی (فیصلہ دینے والی اتھارٹی) تجویز کیا ہے کہ اسلام میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں۔ اس میں جملہ امورِ مملکت کی طرف سے طے پاتے ہیں اور وہی قوانین کی تعبیر کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔

عدل کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا حصول بلا قیمت ہو۔ آپ سوچئے کہ کیا اس قسم کی صورت کبھی عدل کہلا سکتی ہے کہ آپ کسی صاحبِ ثروت سے جا کر کہیں کہ میں کمزور ہوں، اور فلاں زور آور میرا حق دبا کر بیٹھ گیا ہے۔ آپ میری

مدد کریں اور میرا حق اس سے دلا دیں۔ اور وہ آپ سے کہے کہ مجھے پانسو روپیہ دو تب تمہاری مدد کروں گا! اسلامی حکومت کا تو یہ فریضہ ہے کہ وہ مظلوم کی مدد کرے اور حق دار کو اس کا حق دلا دے۔ ایسا کرنے میں مظلوم سے معاوضہ کس بات کا؟ یہ تو مملکت کا بنیادی فریضہ ہے اور فریضہ کی ادائیگی کا معاوضہ کیسا؟

اسلامی مملکت میں عدل کا تقاضا ایک اور بھی ہے۔ حکومت اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی جان، مال، عصمت، عزت، آبرو کی حفاظت کریگی۔ اگر کسی شخص کا (اس کی اپنی غلطی یا غفلت کے بغیر) اس باب میں کوئی نقصان ہوتا ہے تو اس کی ذمہ دار حکومت ہوتی ہے۔ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ

(۱) اس شخص کے نقصان کی امکانی تلافی کرے۔ اور

(۲) مجرم کو اس کے جرم کی سزا دے تاکہ معاشرہ میں جرائم کی روک تھام ہو جائے۔

آپ سوچئے کہ ایک شخص کا ہزار روپیہ چوری چلا جاتا ہے اور حکومت، چور کو سال بھر کے لئے قید کر دیتی ہے، تو اس سے اس شخص کے ساتھ عدل کیا ہوا جس کا مال چوری چلا گیا تھا! چور کو سزا دینا، ظالم کے ساتھ عدل ہوا، مظلوم کے ساتھ نہیں۔ عدل، ظالم اور مظلوم دونوں کے ساتھ ہونا چاہیئے۔

قرآنی عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جب تک کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے، نہ اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچائی جائے اور نہ ہی وہ معاشرہ کی نگاہوں میں حقیر سمجھا جائے۔ تفتیش کے سلسلہ میں ملزم کے خلاف پولیس کا تشدد یا عدالتی فیصلہ تک ملزم کو جیل خانہ میں محبوس رکھنا، عدل کے منافی ہے — اور بغیر مقدمہ چلائے کسی کو سزا دے دینا سراسر ظلم۔

قرآنِ کریم نے بعض جرائم (قتل، چوری، زنا اور بغاوت) کی سزا بھی مقرر کی ہے۔ یہ سزائیں کن حالات میں اور کن شرائط کے مطابق دی جا سکتی ہیں، اس کے متعلق قارئین کی توجہ اس مقالہ کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے جو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جنوری ۱۹۷۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ قانون سازی کے سلسلہ میں وہ مقالہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

قرآنِ کریم نے اسلامی معاشرہ کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲:۶۲) کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ خوف خطرہ کے احساس سے لاحق ہوتا ہے اور حزن دل کی افسردگی اور پریشانی کو کہتے ہیں۔ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افرادِ مملکت اپنے آپ کو ہر قسم کے خطرہ سے محفوظ و مامون محسوس کریں اور امن پسند شہریوں کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہ عدل کا بنیادی تقاضا ہوگا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۵۳:۳۸) اسلامی معاشرہ میں کبھی ایسی صورت پیدا نہیں ہوگی کہ بوجھ کسی کا ہو اور اسے اٹھانا کسی اور کو پڑے۔ ہر شخص کو اپنا فریضہ آپ ادا کرنا ہوگا اور ہر فرد اپنے اعمال کے نتائج کا آپ ذمہ دار ہوگا۔ اس میں نہ کوئی مجرم قصاص (جرم کے مؤاخذہ) سے بچ سکیگا اور نہ ہی کسی

بے گناہ کو سزا دیا جائے گا۔ اس میں کرے کوئی اور بھرے کوئی" کی دھاندلی بھی نہیں ہوگی اور قانون کی نگاہوں میں چھوٹے اور بڑے کی تمیز بھی نہیں ـــ حتیٰ کہ سربراہِ مملکت بھی قانون سے بالا نہیں سمجھا جائے گا۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۷۹) اس معاشرہ کا اصول ہوگا ـــ یعنی نہ تم کسی پر زیادتی کرو نہ تم پر کوئی زیادتی کرنے پائے۔ لہٰذا اسلامی مملکت کے آئین میں یہ شق بھی ہونی چاہیئے کہ

> معاشرتی اور قانونی عدل مملکت کا بنیادی فریضہ ہوگا۔ معاشرتی عدل سے مراد یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ کو وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جن کی تشریح "بنیادی حقوق" سے متعلق باب میں کی گئی ہے اور ان کے عدم حصول کی صورت میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے گا۔
>
> قانونی عدل سے مراد یہ ہے کہ ہر متنازعہ معاملہ کا فیصلہ قانون کی رُو سے ہوگا، اور اس کے لئے کوئی معاوضہ نہیں لیا جائے گا۔ نیز فیصلہ میں یہ امر ملحوظ رکھا جائے گا کہ مظلوم کے نقصان کی بھی امکانی تلافی ہو جائے۔

(۰)

۱۰۔ نفسیاتی تبدیلی

لیکن معاشرہ کی اصلاح "تمامتر" قانون کی رُو سے نہیں ہو سکتی۔ قانون تو ان مستثنیات (EXCEPTIONAL CASES) کے لئے ہوتا ہے جن کی اصلاح عقوبت کے خوف کے سوا کسی طرح سے نہ ہو سکتی ہو۔ معاشرہ کی اصلاح قلب و نظر کی تبدیلی سے ہی ہو سکتی ہے جس کا ذریعہ صحیح تعلیم و تربیت ہے۔ قلب و نظر کی یہی وہ تبدیلی ہے جس سے انسان کے دل میں قانون کا احترام پیدا ہوتا ہے۔ دیکھئے قرآن اس باب میں کن گہرائیوں تک پہنچتا ہے جب کہتا ہے کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔ تیرے رب کی قسم! یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک اپنے تمام متنازعہ فیہ امور میں تجھے اپنا حکم (فیصلہ دینے والا) تسلیم نہ کریں۔ اور اس کے بعد ان کی کیفیت یہ نہ ہو، ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ۔ کہ جو فیصلہ تو دے اس کے خلاف یا اپنے دل کی گہرائیوں میں بھی کسی قسم کی گرانی اور کبیدگی محسوس نہ کریں۔ (وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۴/۶۵) اور یوں دل کے جھکاؤ کے ساتھ، تیرے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں ـــ قانون کے مطابق فیصلہ کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی گرانی محسوس نہ کرنا، یہ ہے قلب و نگاہ کی وہ تبدیلی جس سے قانون کا صحیح احترام پیدا ہوتا ہے۔

اور قانون کا یہی احترام ہے جس سے معاشرہ کی اصلاح ممکن ہے ۔۔۔ معاشرہ کی اصلاح ہی نہیں، بلکہ قوم کے عروج و زوال، اس کی سرفرازی اور زبوں حالی کا دارومدار اسی نفسیاتی تبدیلی پر ہے کہ قرآن کا ارشاد ہے کہ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ۔ (۱۳/۱۱)

خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا کر لے۔

افرادِ قوم کے اندر اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم کا انتظام ایسا کیا جائے جس سے قرآن کی مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آرزو نوجوانانِ ملت کے دل کا تقاضا بن جائے۔

(۰)

۱۱۔ افراد اور مملکت کا تعلق

افراد اور مملکت کے باہمی تعلق کو قرآن کریم نے ایک آیت میں ایسی جامعیت سے بیان کیا ہے کہ جوں جوں نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے انسان وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَ أَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱)

یقیناً اللہ نے مومنین سے ان کے نفوس اور اموال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔

یعنی خدا اور بندۂ مومن کے مابین بیع و شریٰ کا ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی رو سے عبدِ مومن اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اس کے عوض خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ واضح رہے کہ بیع و شریٰ کا یہ معاملہ یونہی نظری اور اعتقادی نہیں ۔۔۔ خدا کی طرف سے یہ معاملہ وہ حکومت طے کرتی ہے جو دنیا میں خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے (اور جسے اسلامی مملکت کہا جاتا ہے)۔ افرادِ معاشرہ اپنی جان اور مال حکومتِ خداوندی کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور حکومت اس کا انتظام کرتی ہے کہ انہیں اس دنیا میں بھی جنت کی زندگی میسر ہو اور آخرت میں بھی۔ جنت کی زندگی کی تفاصیل طول طویل ہیں لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ اس میں انسان کو ہر قسم کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں اور اس کے ساتھ قلبی اطمینان اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ (اُخروی دنیا کی جنت اس پر مستزاد ہے)۔

یاد رہے کہ فسطائی نظام میں جو مملکت (STATE) کو معبود قرار دے کر افرادِ معاشرہ کو اس کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے، قرآن کے معاملۂ بیع و شریٰ میں یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ اس میں افراد کو جو جنت کی زندگی کی ضمانت دی جاتی ہے تو اس زندگی میں افراد نہ کسی انسان کے محتاج ہوتے ہیں نہ محکوم۔ اس میں محکومی صرف

قوانین خداوندی کی ہوتی ہے اور نظام مملکت ہر ایک کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے کا ذمہ دار۔ لہٰذا اس نظام میں سلطانی نظام کا استبداد نہیں ہوتا جس میں افراد کی ہر قسم کی آزادی، اسٹیٹ کی کالی ماتا کے استھان پر قربان کر دی جاتی ہے۔ یہ وہ آستانِ خداوندی ہوتا ہے جس کے متعلق اقبال نے کہا ہے کہ

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

لہٰذا اسلامی آئین میں ایک شق یہ بھی ہوگی کہ

مملکت میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محکوم ہوگا نہ محتاج۔ اس میں حکومت صرف قانون کی ہوگی جس سے کوئی شخص بھی بالا نہیں ہوگا۔ مملکت، عدل و احسان کی عام کارفرمائی سے ملک میں ایسی فضا پیدا کرے گی جس سے قانون کا احترام افراد مملکت کے دل کی گہرائیوں کا تقاضا بن جائے اور اس طرح ہر شخص بلا خوف و حزن زندگی بسر کرے۔

(۰)

۱۲۔ معاشی نظام

قرآن کریم نے کہا ہے کہ مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں، بلکہ وہ ایک بلند و بالا مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد یہ ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۔ (۲۲/۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ہم زمامِ اقتدار ان کے ہاتھ میں دینگے تو یہ

(۱) اقامتِ صلوٰۃ کا انتظام کریں گے۔

(۲) ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔

(۳) ایسے قوانین کا نفاذ کریں گے جو قرآن کی رُو سے قابلِ قبول ہوں۔

(۴) ان قوانین و رسوم کو منسوخ کرینگے جنہیں قرآن ناپسند کرتا ہو۔

(۵) غرضیکہ ان کے تمام معاملات، پروگرام خداوندی کی تکمیل کے لئے ہونگے۔

ان مقاصد میں سے ہم سردست "ایتائے زکوٰۃ" سے بحث کرینگے کیونکہ اسی کا تعلق موضوع زیر نظر سے ہے۔

ہمارے ہاں "ایتائے زکوٰۃ" کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ زکوٰۃ دیں گے۔ اور زکوٰۃ سے مراد یہ لیا جاتا ہے کہ جمع شدہ مال و دولت سے سال کے بعد اڑھائی فیصد روپیہ نکال کر غریبوں کو دے دینا۔ ایتائے زکوٰۃ کا یہ مفہوم قرآنی نہیں اول تو اس لئے کہ اس قسم کی (اڑھائی فیصد والی) زکوٰۃ کا قرآن کریم میں کہیں ذکر نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس قسم کی زکوٰۃ دینے کے لئے مسلمانوں کی اپنی حکومت کا ہونا لازمی نہیں۔ یہ زکوٰۃ تو ہم ہندوستان میں انگریز کی محکومی کے زمانے میں بھی دیا کرتے تھے اور ہندوستان کا مسلمان' ہندو کی محکومی میں رہتا ہوا' اب بھی دے سکتا ہے اور دیتا ہے۔ یہ "ایتائے زکوٰۃ" تو کوئی ایسا فریضہ ہے جو صرف اپنی آزاد مملکت ہی میں سرانجام دیا جا سکتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ یہ افراد کا نہیں خود مملکت کا فریضہ ہے۔ اور تیسرے اس لئے کہ قرآن کریم کی رُو سے مال و دولت جمع کرنے کی اجازت ہی نہیں' اس لئے 'جمع کردہ مال و دولت' پر زکوٰۃ کا تصور صحیح نہیں ہو سکتا۔

• "زکوٰۃ" کے معنی ہیں بڑھنا، پھولنا پھلنا، نشوونما پانا۔ قرآن نے کہا یہ ہے کہ جب دنیا میں جماعت مومنین برسراقتدار آئے گی تو ان کی حکومت کا فریضہ ہوگا کہ وہ افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائے۔ سامانِ نشوونما میں انسان کی طبیعی زندگی کی ضروریات ـــ روٹی، کپڑا، مکان، آسائش، علاج معالجہ' اور اس کی انسانی صلاحیتوں کی برومندی کے لئے ضروری انتظامات' سب آجاتے ہیں۔ دوسری جگہ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ وَهُمْ لِلزَّكَوٰةِ فَاعِلُوْنَ (۲۳/۴)۔ یہ لوگ (مومنین) زکوٰۃ (سامانِ نشوونما بہم پہنچانے) کا انتظام کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ نوعِ انسان کو سامانِ زیست (رزق) بہم پہنچانے کی ذمہ داری خدا نے خود اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۱)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی۔

جو مملکت خدا کے نام پر قائم ہو اس کا فریضہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں' وہ انہیں پورا کرے۔ لہٰذا' اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ افراد معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی مملکت ایسی عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک وسائل پیداوار اس کی اپنی تحویل میں نہ ہوں۔ اگر وسائل پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت میں رہیں تو مملکت اپنی اس ذمہ داری کو پورا کس طرح کر سکتی ہے؟

وسائل پیداوار میں بنیادی حیثیت زمین (ارض) کو حاصل ہے اور زمین کو خدا نے اَرْضُ اللّٰہ (۷/۷۳) "خدا کی زمین" قرار دیا ہے۔ اسے نوعِ انسان کے لئے روزی کا سامان بنایا ہے۔ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ (۷/۱۰)۔ اس میں جو کچھ ہے' رِزْقًا لِّلْعِبَادِ ہے۔ یعنی بندوں کے لئے رزق (۵۰/۱۱) لہٰذا اسے سَوَآءً

لِلسَّائِلِیْنَ (۱۰/۴۱) رہنا چاہیئے۔ یعنی تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلی۔ اسے مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ ـ (۷۳/۵۶) یعنی تمام بھوکوں کے لئے سامانِ رزق ہونا چاہیئے۔

زمین سے ایک تو سامانِ خوراک برآمد ہوتا ہے اور دوسرے وہ تمام خام مسالہ (RAW MATERIAL) معدنیات وغیرہ جن سے مصنوعات تیار ہوتی ہیں۔ لہٰذا مِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ (۲/۲۶۷) میں زراعت اور صنعت و حرفت، دونوں آجاتی ہیں۔

اب رہی انسانوں کی کمائی، تو اسے قرآن نے اموال الناس، یا اموالکم کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی لوگوں کا مال یا تمہارا مال۔ لیکن اس مال پر بھی کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ایک شخص مومن کہلاتا ہی اس وقت ہے جب وہ اس معاہدہ پر دستخط کر دیتا ہے جس کی رُو سے وہ اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ (اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ـ (۹/۱۱۱)۔ لہٰذا، مومن کا مال بھی اس کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہتا۔ یہی وہ نظام ہے جس کے متعلق کہا کہ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ـ اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنے مال میں سے کس قدر "زکوٰۃ" (افرادِ انسانیہ کو سامانِ نشوونما پہنچانے) کے لئے دیدیں۔ کہا کہ ان سے کہہ دو ــ قُلِ الْعَفْوَ ـ (۲/۲۱۹) جتنا تمہاری اپنی ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔ اس نظام کی رُو سے آپ دیکھئے کہ

(۱) نہ تو زمین کسی کی انفرادی ملکیت میں رہتی ہے۔ اور

(۲) نہ ہی فالتو روپیہ (SURPLUS MONEY) کسی کے قبضے میں رہتا ہے۔ لہٰذا اس میں جائیدادیں بنانے کا امکان ہی نہیں ہوتا۔ اور چونکہ تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے، اس لئے اس نظام میں، ملازمین کی تنخواہیں یا مزدوروں کی اجرت (WAGES) مقرر کرنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس نظام کا بنیادی اصول یہ ہوتا ہے کہ

> ہر فرد، اپنی اپنی استعداد کے مطابق، وہ کام کرے، جسے، اس کی اہلیت و صلاحیت کے پیشِ نظر اس کے سپرد کیا گیا ہو، اور ہر ایک کی ضروریاتِ زندگی مملکت کی طرف سے پوری ہوتی رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے وسائلِ پیداوار کا مملکت کی تحویل میں رہنا ضروری ہے۔

یہ ہے قرآن کے معاشی پروگرام کا منتہیٰ۔ اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہوگا کہ اسے اپنے آئین میں بطور نصب العین (ULTIMATE GOAL) درج کرے اور اس کے بعد ایک عملی پروگرام مرتب

کرے جس کی رو سے آہستہ آہستہ بتدریج اس منتہیٰ تک پہنچا جا سکے۔

(۱)

۱۳۔ غیر مسلموں کی پوزیشن

اس آئین کی شق ۱۲ میں بتایا جا چکا ہے کہ اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلم، مسلم قوم کے افراد نہیں تسلیم کئے جا سکتے۔ اس لئے انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے سے باہر کے انسانوں پر یہ دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیتا ہے۔ وہ اپنی آئیڈیالوجی کی دعوت کو عام کرتا ہے یعنی وہ اس دعوت کو دنیا کے تمام انسانوں کے سامنے بلا لحاظ رنگ، نسل، وطن، زبان، مذہب یکساں طور پر پیش کرتا ہے اور ان سے کہہ دیتا ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی پر خود غور و فکر کریں، اور اس کے بعد اگر علیٰ وجہ البصیرت اور بطیبِ خاطر (یعنی دل اور دماغ کی رضامندی سے) سمجھیں کہ یہ آئیڈیالوجی ان کیلئے قابلِ قبول ہے تو اسے قبول کر لیں اور اگر ایسا نہ سمجھیں تو اسے مسترد کر دیں۔ اس میں کسی قسم کا جور و اکراہ نہیں ہوگا۔ (لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲/۲۵۶)) یہی قرآن کی مستقل قدر یا افرادِ مملکت کا بلا شرط حق ہے۔ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (۳۹/۴۱) ہم نے تجھ پر یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے جو تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر کھلی ہے)۔ سو جو شخص (اسے قبول کر کے) سیدھی راہ پر چلے گا تو اس کا فائدہ خود اسے پہنچے گا اور جو غلط راستہ اختیار کرے گا تو اس کا نقصان بھی خود بھگتے گا۔ اے رسول! تو ان کے فیصلے اور عمل کا ذمہ دار نہیں (نہ ہی ان پر داروغہ مقرر کیا گیا ہے کہ انہیں زبردستی صحیح راستے پر لائے)

اس سے قرآن نے اسلامی ملت میں شامل ہونے اور اسلامی مملکت میں شریکِ کار بننے کے لئے دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جی چاہے اندر داخل ہو جائے۔ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۷۳/۱۹)۔ "جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے"۔ اس "اذنِ عام" کے بعد اگر کوئی شخص اس کے اندر آنا نہیں چاہتا تو وہ اپنے عمل کا آپ ذمہ دار ہے۔ سورۂ فاطر میں اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے جہاں کہا ہے کہ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ۔ "اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زمین میں حکومت عطا کی ہے"۔ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ۔ اگر کوئی شخص اس آئین و دستور کو نہیں مانتا جس پر اس حکومت کی عمارت استوار ہے تو اس کے لئے وہ خود ذمہ دار ہے۔ اس آئینِ مملکت (اسلامی آئیڈیالوجی) کو تسلیم نہ کرنے سے اگر وہ کسی قسم کے نقصان میں رہتا ہے تو اسے اس کی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ اس لئے کہ خود کردہ را علاجے نیست۔ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص کسی آئیڈیالوجی کو تسلیم نہ کرے لیکن اسے تسلیم کرنے والوں کو جو مفاد حاصل ہیں ان میں برابر کا شریک ہونا چاہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اگر اس کے انکار سے اسے کچھ نقصان

ہوتا ہے تو اسے اس نقصان کو برداشت کرنا ہوگا۔ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِلَّا مَقْتًا۔ وَلَا يَزِيدُ الْكَافِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا (۳۵/۳۹) اس انکار سے انہوں نے خیر و برکت کے جو دروازے اپنے اوپر بند کئے ہیں اس کے نقصان کے وہ خود ذمہ دار ہیں۔ اس کا افسوس ضرور ہے۔ (يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ (۳۶/۳۰) لیکن اسکا علاج ہمارے پاس نہیں۔ علاج خود ان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یہ دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ وہ جس وقت بھی اپنی غلطی کو محسوس کریں اس کا ازالہ کر لیں۔ اس آئیڈیالوجی کو تسلیم کر لیں اور بلا روک ٹوک اس کے اندر داخل ہو جائیں۔

حیرت ہے کہ بعض حلقوں میں اس نظریہ کو قابلِ اعتراض سمجھا جاتا ہے اور اسے "تنگ نظری" پر محمول کیا جاتا ہے حالانکہ کوئی نظام جو آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر استوار ہو ان لوگوں کو کبھی شریکِ حکومت نہیں کر سکتا جو اس آئیڈیالوجی کے مخالف ہوں۔ آئیڈیالوجی تو خیر بہت بڑی چیز ہے، عام جمہوری حکومتوں میں جو پارٹی برسرِ اقتدار ہو وہ مخالف پارٹی کے افراد کو شریکِ حکومت نہیں کرتی۔ اسلام کے معاملہ میں بات اس سے بھی کہیں آگے بڑھ جاتی ہے۔ اسلامی مملکت کا آئین درحقیقت اس کی آئیڈیالوجی ہوتا ہے۔ جو لوگ اس آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے وہ اس مملکت کے آئین کو تسلیم نہیں کرتے۔ اب سوچئے کہ دنیا میں کوئی مملکت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو ان لوگوں کو شریکِ حکومت کر لے جو اسکے آئین کو تسلیم نہ کریں؟ کیا یہ عجیب بات نہ ہوگی کہ اسلامی مملکت کا مقصد اور نصب العین تو قوانینِ خداوندی کی عملاً تنفیذ ہو اور اس مقصد کے حصول میں ان لوگوں کو شریک کر لیا جائے جو خود اس مقصد ہی کے خلاف ہوں؟

لیکن اسکے یہ معنی نہیں کہ غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں کوئی حقوق حاصل نہیں ہونگے۔ انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جنہیں قرآن کریم انسانوں کے لئے بنیادی حقوق قرار دیتا ہے۔ انکی جان، مال، عزت، عبادتگاہیں سب محفوظ ہونگی۔ انہیں شخصی مذہب کی آزادی ہوگی۔ ان سے حسنِ سلوک کیا جائیگا (۶۰/۸) ان سے ہر حال میں عدل کیا جائیگا (۵/۸) حقیقت یہ ہے کہ ایک لحاظ سے یہ مسلمانوں سے بھی زیادہ فائدہ میں رہینگے کہ گائے کے سینگ مسلمانوں کے سپرد ہونگے اور اس کے دودھ میں یہ غیر مسلم بھی حصہ دار ہونگے؟ دشمن حملہ آور ہوگا تو مسلمان فوجیں اپنے سینوں پر گولیاں کھا کر غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کی حفاظت کرینگی۔ (۲۲/۴۰)

ان تمام مراعات کے باوجود، اگر یہ غیر مسلم ترکِ وطن کرنا چاہیں تو انہیں ان کے مامن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام اسلامی مملکت کے ذمہ ہوگا۔ قرآن میں ہے۔

وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ (۹/۶)۔ اور اگر مشرکین میں سے کوئی تمہارے پاس پناہ لے تو اسے پناہ دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر (اگر وہ کہیں اور جانا چاہے تو) اسے اسکے امن کی جگہ تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ یہ بات سمجھتے نہیں (کہ قرآن کریم کے ماتحت زندگی بسر کرنے سے کیا کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں)

لیکن اگر وہ اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے اس کے آئین سے سرکشی برتیں تو انہیں بغاوت کی سزا ملے گی۔ (۵/۳۳) بغاوت کی سزا مسلم اور غیر مسلم سب کے لئے یکساں ہے ــــ لہٰذا اسلامی آئین کی ایک شق یہ ہوگی کہ

مملکت میں بسنے والے غیر مسلم امورِ مملکت میں شریک نہیں کئے جا سکینگے کیونکہ وہ اسلامی آئین کو تسلیم نہیں کرتے اور اس وجہ سے مسلم قوم کے افراد نہیں بننا چاہتے لیکن ان لوگوں کو تمام بنیادی حقوقِ انسانیت حاصل ہونگے۔ ان کی جان، مال، آبرو پرستش گاہیں محفوظ رہینگی انہیں شخصی مذہبی آزادی ہوگی۔ ان سے عدل و انصاف کرنے میں ان میں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔

اسکے باوجود اگر یہ لوگ کسی ایسی مملکت کیطرف مستقل طور پر منتقل ہونا چاہیں جو انہیں اپنے ہاں بسانے پر آمادہ ہو تو اسلامی مملکت انہیں انکے مامن تک بحفاظت پہنچانے کا انتظام کریگی۔

لیکن اگر یہ مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس کے آئین و قوانین سے سرکشی برتینگے تو انہیں اس بغاوت کی وہی سزا دیجائیگی جو مسلمان باغیوں کے لئے مقرر ہوگی۔

(۰)

۱۴۔ بنیادی حقوق

اصولاً ہر حق کسی نہ کسی ذمہ داری کے پورا کرنے کے نتیجہ میں قائم ہوتا ہے۔ مثلاً ہم مومن اور خدا کے مابین جس معاہدہ کا پہلے ذکر کر چکے ہیں (یعنی مومن اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے اور خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے) تو مومن جنت کا حقدار اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ اپنی ذمہ داری کو پورا کرے۔ لیکن اس اصول میں بعض مستثنیات بھی ہیں جن میں حق بغیر ذمہ داری کے واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً جو شخص کام کرنے کے قابل نہ رہے وہ مملکت سے سامانِ زندگی بطور حق طلب کر سکتا ہے (فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ) نیز بعض حقوق خاص شرائط کے ساتھ مشروط ہوتے ہیں۔ مثلاً جان کی حفاظت ہر فرد معاشرہ کا حق ہے۔ لیکن جرمِ قتل کی سزا میں اسے اس حق سے محروم کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں حقوق کی کوئی الگ فہرست نہیں دی گئی۔ اس نے مستقل اقدار کا ذکر کیا ہے جن کا تحفظ اسلامی مملکت کا فریضہ ہوتا ہے۔ انہی اقدار (یا مملکت کی ذمہ داریوں) سے حقوق مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً۔

۱۔ احترامِ آدمیت۔

ہر انسانی بچہ محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں طور پر عزت کا مستحق ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے (۱۷/۷۰)۔ اس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ افرادِ مملکت کی قیمت متعین کرنے (یعنی معاشرہ میں ان کا مقام مقرر کرنے) میں ان کی پیدائش (حسب و نسب) کے اعتبار سے کوئی تفریق و تخصیص نہیں کی جائیگی۔

۲۔ جنسی مساوات

قرآن کی رُو سے جنسی تفریق نہ وجہِ ذلت ہے نہ باعثِ امتیاز۔ یعنی نہ مرد محض مرد ہونے کی حیثیت سے عورتوں سے افضل ہیں اور نہ ہی عورتیں، محض عورت ہونے کی حیثیت سے مردوں سے کمتر۔ فطری وظائف کے اعتبار سے ان کے فرائضِ زندگی میں فرق ضرور ہے لیکن جس مقام کا مستحق ایک انسان ہے اس میں مرد اور عورت دونوں یکساں طور پر شریک ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے دروازے ایک صنف کے لئے کھلے رہیں اور دوسری پر بند کر دیئے جائیں۔

۳۔ مدارج کا معیار جوہرِ ذاتی

معاشرہ میں ہر فرد کا مقام اس کے جوہرِ ذاتی اور حسنِ کردار کی بنا پر متعین کیا جائے گا۔ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹) قرآن کی مستقل قدر ہے۔ یعنی ہر ایک کے مدارج اس کے اعمال کے مطابق۔ اسلامی مملکت میں تعینِ مدارج کا کوئی دوسرا معیار نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص کا حق ہے کہ اسے اس کی صلاحیتوں کے مطابق مقام عطا ہو۔

۴۔ حقِ آزادی

قرآن کی رُو سے آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہو۔ (۳/۶۴)۔ لا الٰہ الا اللہ اس آزادی کا منشور ہے۔

۵۔ عدل و احسان

عدل کے معنی ہیں ہر شخص کو اس کا حق مل جانا۔ اور احسان کے معنی ہیں جس شخص میں کوئی کمی رہ جائے اس کمی کا پورا کر دینا۔ عدل اور احسان اسلامی مملکت کا فریضہ ہے (۱۶/۹۰) اور افرادِ مملکت کا حق۔

۶۔ رزق (سامانِ زیست) کا حق

ہم دیکھ چکے ہیں کہ افرادِ معاشرہ کو ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا مملکت کا بنیادی فریضہ ہے لہٰذا افرادِ معاشرہ کا حق۔ لیکن یہ حق مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ کام کرنے کے قابل ہر فرد، اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق وہ کام سرانجام دے جسے اس کے سپرد کیا گیا ہے۔

سامانِ زیست میں وہ اسباب و ذرائع بھی شامل ہیں جو انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً تعلیم و تربیت۔ اسے ہر انسانی بچہ بطور استحقاق طلب کر سکتا ہے۔

۷۔ جان کی حفاظت

افرادِ معاشرہ کی جان کی حفاظت اسلامی مملکت کا فریضہ ہے لیکن جب جرم کی پاداش میں سزائے موت دی جائے تو مجرم کا یہ حق سلب ہو جاتا ہے۔

اور جنگ کی صورت میں اپنی جانوں کو خود پیش کر دینا مومنین کے اس معاہدہ کی شرط ہوتا ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

۸ - مال کی حفاظت

جان کی حفاظت کے بعد ان چیزوں کی حفاظت بھی مملکت کا فریضہ ہے جو مملکت کی اجازت سے افراد کے ذاتی تصرف میں رہیں۔ کوئی اس کا مجاز نہیں ہوتا کہ جو چیز مملکت کی طرف سے کسی ایک فرد کے تصرف میں رہنے کے لئے دی گئی ہے اسے دوسرا فرد زبردستی اپنے قبضہ میں لے لے۔ (۴/۲۹)

۹ - سکونت کی حفاظت

ضروریاتِ زندگی میں جن کا بہم پہنچانا مملکت کا فریضہ ہوتا ہے، رہائش کا انتظام (مکان) خود بخود آ جاتا ہے اس لئے کسی کو سکونت سے محروم کر دینا اس کے اس حق کو سلب کر لینا ہے۔ (۲/۸۵)

۱۰ - عصمت کی حفاظت

عصمت انسان کا شرف ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس کا حیوانات میں احساس تک نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن کریم اس کی حفاظت کو بنیادی اور غیر مشروط حق قرار دیتا ہے۔ (۲۴/۲ ؛ ۳۳/۶۰)

۱۱ - شادی میں انتخاب کا حق

مرد اور عورت کے مابین، قوانینِ خداوندی کے مطابق، ازدواجی زندگی بسر کرنے کے معاہدہ کا نام نکاح ہے۔ اور ظاہر ہے کہ معاہدہ کے لئے فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔ اسلئے قرآن تاکید کرتا ہے کہ یہ معاہدہ فریقین کی رضامندی سے ہونا چاہیئے (۴/۲۴ ؛ ۴/۱۹) اور ظاہر ہے کہ جس طرح اس معاہدہ کے استوار کرنے میں فریقین کو برابر کا حق حاصل ہے اسی طرح عند الضرورت اسے فسخ کرنے کا حق بھی فریقین کو یکساں طور پر حاصل ہوگا۔

۱۲ - حسنِ ذوق کا حق

قرآن انسان کے انفرادی حسنِ ذوق کا احترام کرتا ہے اور کسی کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اسے اسکے اس حق سے محروم کر دے (۷/۳۲)۔ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سامانِ زیبائش و آرائش سے متمتع ہونا ہر فرد کا حق ہے۔

۱۳ - مذہبی آزادی کا حق

مذہب کے معاملہ میں قرآن ہر انسان کو پوری پوری آزادی دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ایمان نام ہے کسی بات کو عقل و فکر کی رو سے علیٰ وجہ البصیرت ماننے کا۔ لہٰذا اس میں جور و اکراہ کا کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ (۲/۲۵۶) اسکا بنیادی اصول ہے اور ہر فرد کو اس کا حق دیتا ہے کہ وہ کفر اور ایمان میں سے جونسا راستہ جی میں آئے اختیار کر لے۔ (۱۸/۲۹)۔ لہٰذا مذہب کے معاملہ میں کسی پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی مملکت کا اتنا ہی فریضہ نہیں کہ وہ مذہب کے معاملہ میں ہر ایک کو آزادی دے۔ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ تمام اہلِ مذاہب ... کی پرستش گاہوں کی حفاظت کرے (۲۲/۴۰) اور یہ دیکھے کہ کوئی شخص کسی دوسرے مذہب کی واجب الاحترام ہستیوں کی

بے حرمتی نہ کرے۔ (۹/۱۰۹)

لیکن اسلام ایک مذہب نہیں بلکہ دین (نظامِ زندگی) ہے جس کے مطابق اسلامی مملکت قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ اس کی تو اجازت دیتا ہے کہ جس کا جی چاہے اس جماعت (امتِ مسلمہ) میں شامل ہو جائے جو اس مملکت کے قیام کی ذمہ دار ہے اور جس کا جی چاہے اس میں شامل نہ ہو (غیر مسلم رہے)۔ لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اس حدودِ مملکت میں رہنے والے کوئی دوسرا نظامِ مملکت قائم کرلیں۔ یہ تو ریاست درونِ ریاست (STATE WITHIN A STATE) قائم کرنے کے مرادف ہوگا جس کی کہیں بھی اجازت نہیں مل سکتی۔ نہ ہی اس کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ جس کا جی چاہے اس مملکت کے قوانین کی پابندی کرے اور جس کا جی چاہے ان سے انحراف کرے۔ قوانینِ مملکت سے انحراف، جرم ہوتا ہے اور ان سے سرکشی، بغاوت۔ غیر مسلموں کو ان کے شخصی معاملات میں اپنے مذہب کی پیروی کی اجازت ہوگی، قوانینِ مملکت کے سلسلہ میں نہیں۔

۱۴۔ مظلوم کو فریاد کا حق

قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہر مظلوم کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ظلم کی فریاد کرے (۴/۱۴۸) اس کے اس حق کو کوئی چھین نہیں سکتا۔ اسی طرح وہ اس کا بھی حق دیتا ہے (حق ہی نہیں دیتا بلکہ اس کی تاکید کرتا ہے کہ) ہر شخص حق اور انصاف کی شہادت دے، خواہ وہ کسی کے خلاف بھی کیوں نہ جائے۔ (۴/۱۳۵)

۱۵۔ ملزم کا حقِ حفاظت

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ جب تک کسی کا جرم ثابت نہ ہو جائے، اسے بے گناہ سمجھا جائے۔ نہ اسے کسی قسم کی تکلیف پہنچائی جائے اور نہ ہی اسے معاشرہ میں حقارت کی نظروں سے دیکھا جائے۔ سزا جرم کی ہوگی، الزام کی نہیں۔ (۲۴/۱۲ ، ۴۹/۱۲)

۱۶۔ امن واطمینان کی ضمانت

اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ افرادِ معاشرہ کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہو۔ نہ ہی انہیں خواہ مخواہ پریشان ہونا پڑے۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) کی فضا پیدا کرنا اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔

۱۷۔ اپنی اپنی ذمہ داری

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (۶/۱۶۴) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ اسلامی مملکت کا بنیادی شعار، اور افرادِ مملکت کا بنیادی حق ہے۔ ہر شخص اپنا اپنا فریضہ سرانجام دینے کا آپ ذمہ دار ہوگا۔ کوئی شخص اپنی ذمہ داری کسی دوسرے پر نہیں ڈال سکے گا۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ حقوق جو (مشروط اور غیر مشروط طور پر) اسلامی مملکت کے افراد کو حاصل ہوں گے

ان کی ضمانت آئین کی رُو سے دی جانی ضروری ہے۔

(۵)

حرفِ آخر

یہ ہیں ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق، اس آئین کے بنیادی اصول جنہیں قرآنِ کریم، اسلامی مملکت کا اساسی ضابطہ قرار دیتا ہے۔ اس آئین کے علاوہ کوئی اور آئین میزانِ خداوندی میں قابلِ قبول قرار نہیں پا سکتا اسلئے کہ یہ آئین ان اصولوں پر مبنی ہے جن کے مطابق کائنات کا یہ کارگہِ عظیم اس حسن و خوبی سے سرگرمِ عمل ہے۔ قرآن میں ہے اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ۔ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور ضابطۂ حیات اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا۔ (۳/۸۳) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب طوعاً و کرہاً اسکے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ انسان کو اس کا تو اختیار ہے کہ وہ جی چاہے تو خدا کے قوانین کو بطور ضابطہ زندگی اختیار کرلے اور چاہے تو اپنے خود ساختہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرے۔ لیکن اسے اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ

مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۳/۸۵)

جو کوئی الاسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کا وہ دین (آئین) میزانِ خداوندی میں قابلِ قبول نہیں ہوگا اور وہ آخر الامر دیکھ لے گا کہ وہ کسقدر نقصان میں رہا۔

یہ آئین صرف قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت کا ضابطۂ حیات قرآن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی اس مملکت میں کوئی ایسا نظریہ، تصور، یا قانون یا پا سکتا ہے جو قرآنی اصولوں کے خلاف ہو۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا۔ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۔ (۶/۱۱۴)

کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہاری طرف ایک واضح ضابطہ قوانین نازل کر دیا ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے یہ کتاب دی ہے وہ جانتے ہیں کہ تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کی گئی ہے۔ سو تو اس باب میں جھگڑا کرنے والوں میں سے مت ہو۔

اس آئین کے اصول ہر طرح سے مکمل ہیں اور ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (۶/۱۱۶)

اور تیرے رب کی بات صدق و عدل کیساتھ مکمل ہو گئی۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں
وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

یہی آئین خدا کیطرف سے عطا کردہ (یعنی حقیقت پر) مبنی ہے۔ اس کے علاوہ انسانوں نے جو آئین و ضوابط بھی مرتب کئے ہیں وہ حقیقت کے متعلق ظن و قیاس پر مبنی ہیں خواہ ان کے متبعین کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔ ملت اسلامیہ خدا کے دیئے ہوئے الدین کے سوا، کسی اور آئین کا اتباع نہیں کر سکتی۔

وَإِن تُطِعْ أَكْثَرَ مَن فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (۶/۱۱۶)

اگر تو ان لوگوں کی بات ماننا جائے جو دنیا میں اکثریت سے ہیں تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے گمراہ کر دینگے
وہ خود ظن و تخمین کا اتباع کرتے ہیں اور بعض اٹکلیں دوڑاتے ہیں (اس لئے ان کے پیچھے لگنے والے بھی
اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں)۔

اس لئے آئینِ خداوندی کو چھوڑ کر، دیگر اقوام کے آئین و ضوابط کا اتباع کرنا، مسلمان کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ دوسری اقوام کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن ان کے ہاں کی کوئی ایسی چیز قبول نہیں کی جا سکتی جو قرآن کے آئین اور نظام کے خلاف ہو۔ اسلامی آئین کی اصل و بنیاد صرف خدا کی کتاب ہے۔ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ۔ (۱۱/۱۴)

پھر اسے بھی ذہن میں رکھیئے کہ قرآن ایک مکمل ضابطۂ آئین عطا کرتا ہے۔ اس لئے، اس کی رُو سے اس کی اجازت نہیں ہو سکتی کہ آپ کچھ اصول قرآن کے اختیار کر لیں اور کچھ خارج از قرآن، دیگر اقوام کے آئین و ضوابط سے مستعار لے کر۔ ایسا کرنا شرک ہوگا۔ قرآنی آئین کو پورے کا پورا اختیار کرنا ہوگا۔ اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً (۲/۲۰۸)۔ اس کا واضح ارشاد ہے "کتاب کے ایک حصہ پر ایمان لانا اور دوسرے حصے سے انکار کر دینا" ایسا جرم ہے جس کی سزا اس دنیا کی ذلت و خواری اور آخرت کے عذاب شدید کی شکل میں ملتی ہے۔ (۲/۸۵) لہٰذا یہ تو کیا جا سکتا ہے کہ قرآنی آئین کو بطور نصب العین سامنے رکھ کر اس تک بتدریج پہنچنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اسلامی مملکت کے آئین میں کوئی ایسی شق رکھ لی جائے جو قرآنی اصولوں سے متصادم ہو۔ اس قسم کی ایک شق بھی سارے کے سارے آئین کو غیر اسلامی بنا دے گی۔

اور اسلامی مملکت کا نظام، اپنے تدریجی مراحل میں ہو یا انتہائی منزل میں، صرف ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہو سکیگا جن کی سیرت خود قرآنی قالب میں ڈھلی ہو۔ بات خالی آئین اور قانون سازی کی نہیں، سیرت سازی کی بھی ہے۔

کوئی مملکت اسلامی کب کہلا سکتی ہے!

(ایمان اور عمل کا باہمی رشتہ)

طلوعِ اسلام بابت دسمبر ۱۹۷۰ء کے باب المراسلات میں "قرآن کا معاشی نظام اور سوشلزم" کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا تھا، ہمیں خوشی ہوئی کہ وہ بڑا فکر انگیز ثابت ہوا، اور حلقۂ قارئین کی طرف سے اس سلسلہ میں مزید اِسلات موصول ہوئے۔ ان میں تقاضا یہ کیا گیا ہے کہ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر زیادہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں زیادہ خوشی اس سے ہوئی کہ یہ تقاضا بیشتر نوجوان طالب علموں کی طرف سے کیا گیا ہے جنہوں نے لکھا ہے کہ ہماری نئی نسل کے ذہن میں ایمان کی اہمیت تو ایک طرف، اس کا صحیح تصور تک بھی نہیں۔ اور وہ جانتے (بلکہ مانتے) تک نہیں کہ انسانی اعمال کے ساتھ ایمان کا بھی کوئی تعلق ہے اور یہ انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہمیں اس کا علم و احساس ہے کہ آج (ہمارے ہاں ہی نہیں بلکہ ساری دنیا میں) ایمان کی اہمیت بہت کم نظر آتی ہے اور اس باب میں، قدیم نسل اور نژادِ نو سب برابر ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قدامت پرست طبقہ رسمی طور پر ایمان کا اقرار کرتا ہے اور جدید نسل کا نوجوان کھلے بندوں اس کا انکار کرتا ہے۔ جہاں تک کارو بارِ حیات کا تعلق ہے، اس میں ایمان کی اثراندازی نہ اول الذکر کے ہاں دکھائی دیتی ہے نہ ثانی الذکر میں۔ لہٰذا جس طبقہ کی طرف سے ہمیں یہ تقاضا موصول ہوا ہے (کہ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر زیادہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے) ہم اسے سعادت مند سمجھتے ہیں کہ ان کے دل میں کم از کم اس کی اہمیت کا احساس تو ہے۔

سوال کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہم ایک مرتبہ پھر دہرا دیں کہ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ :-

(۱) قرآن مجید جن باتوں کو اخلاقی محاسن قرار دیتا ہے ــــ مثلاً سچ بولو، جھوٹ نہ بولو، کسی کو فریب نہ دو، چوری نہ کرو، عصمت کی حفاظت کرو، کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کرو، کسی کو ناحق ستاؤ نہیں، غریبوں کی مدد کرو، محتاجوں کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کرو، وغیرہ وغیرہ۔ ایک شخص ان امور کا پابند ہے لیکن وہ نہ خدا کو مانتا ہے نہ وحی کو، نہ رسالت پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ تو اس کے اس انکار سے اس کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اور جو شخص ان امور پہ

ایمان رکھتا ہے اس میں اور اول الذکر میں عملی نقطۂ نگاہ سے فرق کیا ہوتا ہے۔

(۲) ایک قوم اپنے ہاں (مثلاً) وہی نظامِ اقتصادی رائج کرلیتی ہے جسے قرآن تجویز کرتا ہے لیکن وہ قوم خدا اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتی۔ تو اس کے اس اقتصادی نظام کو اسلامی کیوں نہیں کہا جاسکتا۔ یا

(۳) مسلمانوں کی کوئی مملکت، ایسے معاشی نظام کو اپنے ہاں رائج کرلیتی ہے جسے قرآن نے تجویز کیا ہے اور باقی شعبوں میں اس کا التزام نہیں کرتی، تو کیا اس مملکت کو اسلامی مملکت کہا جاسکیگا۔ اگر اسے اسلامی نہیں کہا جائیگا، تو ایک مملکت یا ایک نظام (سسٹم) کس وقت اسلامی کہلانے کا مستحق سمجھا جائیگا۔

یہ ہے ملخص ان سوالات کا جو ہمیں اس سلسلہ میں موصول ہوئے ہیں۔ آیئے ہم ان پر سطح سے ذرا نیچے اتر کر غور کریں۔

(٠)

ان سوالات، اور اسی قسم کے دیگر شکوک و شبہات کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ایمان کا صحیح مفہوم ہمارے سامنے نہیں۔ اور یہ شکوک اس وقت اور بھی بڑھ جاتے ہیں جب ہمارا نوجوان طبقہ دیکھتا ہے کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں فلہذا خدا، رسول، وحی، آخرت پر ایمان کے دعویدار ہیں، اخلاقی اعتبار سے وہ بالعموم ان لوگوں سے بھی پست ہیں جنہیں یہ دہریے اور ملحد کہتے ہیں۔ بنابریں سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایمان کہتے کسے ہیں۔ ایمان چند الفاظ کے دہرا لینے کا نام نہیں۔ ایمان، انسانی زندگی کے متعلق ایک خاص نظریہ، یا (ATTITUDE) کا نام ہے۔ مثلاً انسانی زندگی کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ انسانی بچہ، عام حیوانی بچوں کی طرح، نر و مادہ کے جنسی اختلاط سے وجود میں آجاتا ہے۔ وہ طبیعی قوانین کے تابع زندگی بسر کرتا ہے۔۔۔ کھاتا، پیتا، سوتا، جاگتا اور افزائشِ نسل کرتا ہے۔ اور اس کے بعد طبیعی قوانین کے مطابق مر جاتا ہے اور اس طرح اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ چونکہ انسان ایک متمدن حیوان واقع ہوا ہے، اس لئے اس کا سوسائٹی میں رہنا ضروری ہے۔ اور سوسائٹی میں رہنے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے متعین کردہ قوانین کی اطاعت کرے۔ سوسائٹی کے قوانین خود سوسائٹی کے افراد کے وضع کردہ ہوتے ہیں جو مصلحت کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔

ایک نظریۂ زندگی یہ ہے، اور دوسرا نظریہ یہ کہ جہاں تک طبیعی زندگی کا تعلق ہے، انسان اور حیوان میں بے شک کوئی فرق نہیں، لیکن انسان کی زندگی صرف طبیعی زندگی نہیں۔ اس کی طبیعی زندگی حیات کے ارتقائی پروگرام کی ایک کڑی ہے۔ اس کی آخری کڑی نہیں۔ اس سلسلہ کو آگے بھی جاری رہنا ہے۔ طبیعی سطح پر زندہ رہنے کے لئے تو طبیعی قوانین کافی ہیں، لیکن ارتقاء کی اگلی منزل تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے، طبیعی قوانین سے ماوراء، ایک اور ضابطۂ قوانین کی ضرورت ہے جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار نہ کسی فرد کی وضع کردہ ہیں نہ سوسائٹی کی۔ یہ قوانین فطرت کی طرح خارج میں موجود ہیں اور انسان کو ان کا علم، وحی کی رو سے ہوتا ہے۔ انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات

پر مرتسم ہوتا ہے۔ اگر اس کے اعمالِ حیات مستقل اقدار کے مطابق ہیں تو وہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ زندگی کی پست سطح میں محبوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اعمال کے ان اثرات کے لئے نہ پولیس کی ضرورت ہوتی ہے نہ عدالت کی، یہ خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے از خود مرتب ہوتے رہتے ہیں، اور انمٹ ہوتے ہیں۔

یہ ہے زندگی کا دوسرا نظریہ۔ اس نظریہ کو، علم و بصیرت اور عقل و فکر کی رو سے مبنی بر صداقت اور حقیقت سمجھنا اور قدم قدم پر اسے پیشِ نظر رکھنا 'ایمان' کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس طبعی زندگی کے نظریۂ حیات کو قرآن 'کفر' سے تعبیر کرتا ہے۔ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَ یَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) جو لوگ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے (اور مر جاتے) ہیں وہ کفر کا نظریۂ حیات رکھتے ہیں۔ یہ دونوں نظریاتِ حیات ایک دوسرے سے ممیز، باہمدگر متضاد اور منفرد ہیں۔ یعنی ان میں باہمدگر آمیزش نہیں ہو سکتی۔ ایمان کے نظریۂ حیات کے ساتھ کفر کی آمیزش نہیں ہو سکتی، اور کفر کے نظریہ کے ساتھ ایمان کا امتزاج ممکن نہیں۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ - (۶۴/۲) خدا نے تمہیں پیدا کیا۔ سو تم میں سے بعض کافر ہیں اور بعض مومن۔ سائنس کی زبان میں ان نظریات کو فارمولے سمجھنا چاہیئے۔ ایک فارمولا اسی صورت میں اپنے نتائج مرتب کر سکتا ہے جب اسے خالصۃً عمل میں لایا جائے۔ اگر آپ اس فارمولے میں کسی اور فارمولے کی ذرا سی آمیزش بھی کر دیتے ہیں تو وہ اپنا نتیجہ کبھی مرتب نہیں کریگا۔ قرآن کی اصطلاح میں اس قسم کی آمیزش کو شرک کہا جاتا ہے۔ زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اسے مختلف حصوں میں بانٹا ہی نہیں جا سکتا۔ آم کے درخت کا ایک ایک جزو، جڑ سے لیکر آخری کونپل تک، اس کا ایک ایک ذرہ، ایک ایک ریشہ، آم کے درخت کی خصوصیات رکھتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس کی جڑ کی خصوصیت آم کے درخت کی سی ہو، تنے کی ببول کے درخت کی، شاخوں کی پیپل کے درخت کی اور پتوں کی بیری کے درخت کی، اور اس کے بعد اس میں آم سا پھل لگ جائے۔ اگر انسانی زندگی کی بھی یہ کیفیت ہو جائے کہ اس کا ایک گوشہ، ایک قسم کے نظریہ کے تابع رکھا جائے اور دوسرا گوشہ کسی دوسرے نظریہ کے ماتحت، تو اس کا نتیجہ ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵) کیا تم اس قسم کا مسلکِ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہو کہ اس ضابطۂ حیات کے ایک حصہ پر ایمان لے آؤ اور دوسرے حصے سے انکار کر دو۔ تم میں سے جو کوئی بھی ایسی روش اختیار کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو گا کہ دنیاوی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی اس کے حصے میں آئے گی اور قیامت کے دن وہ شدید ترین عذاب میں مبتلا ہو گا۔ اس لئے، جو نظریۂ حیات اختیار کرنا ہو اسے بالکلیہ اختیار کیا جائے گا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً۔ (۲/۲۰۸) اے جماعتِ مومنین! تم سلامتی بخش نظامِ حیات میں پورے کے پورے بہ تمام و کمال داخل ہو۔ اسی صورت میں تم اس کے انسانیت ساز نتائج سے متمتع ہو سکو گے۔

پھر اسے بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ پیدائشی طور پر نہ کوئی انسان مومن ہوتا ہے نہ کافر۔ ہر شخص کو ایمان یا کفر کا نظریہ خود اختیار کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا - یا - اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کہتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان کا نظریہ اختیار کرتے ہیں، یا وہ لوگ جو کفر کا نظریہ اختیار کرتے ہیں۔ یا مَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ۔ جو شخص غیر خدائی نظریۂ زندگی سے انکار کرتا ہے اور خداوندی نظریۂ حیات اختیار کرتا ہے۔ یعنی ان نظریات کو بالارادہ اختیار کیا جاتا ہے۔ نہ کوئی شخص، بمجرد اس امر کے کہ وہ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہو گیا، مومن قرار پا سکتا ہے، نہ غیر مسلموں کے ہاں پیدا ہونے والا پیدائش کے اعتبار سے کافر۔ واضح رہے کہ قومی نقطۂ نگاہ سے یہ لوگ مسلمان اور غیر مسلم اقوام سے متعلق سمجھے جائیں گے، لیکن قرآنی مقاصد کے لئے انہیں ایمان یا کفر کا نظریہ اپنے ارادے اور فیصلے سے اختیار کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ان لوگوں سے بھی جو پیدائشی طور پر مسلمانوں کی قوم سے متعلق ہوں، ایمان لانے کا تقاضا کرتا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے — یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا — اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ ....(۴/۱۳۶) اے مسلمانو! تم ایمان لاؤ اللہ پر، اور اس کے رسول پر، اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی، اور ان کتابوں پر جو اس سے پہلے خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھیں .... اور آخرت کی زندگی پر۔ سورۃ الحدید میں ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِہٖ ... (۵۷/۲۸) اے مسلمانو! تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور ایمان لاؤ اس کے رسول پر۔ دوسرے مقام پر ہے کہ اے مسلمانو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کا پتہ نشان بتاؤں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلائے۔ وہ یہ ہے کہ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ .... (۶۱/۱۱) تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ آپ نے غور فرمایا کہ وہ پیدائشی مسلمانوں سے بھی ایمان لانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ایمان، ایک خاص نظریۂ حیات کو علیٰ وجہ البصیرت اختیار کرنے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ یہ انسانی قلب و دماغ کا ایک مثبت عمل (POSITIVE ACTION) ہے۔

پھر اسے بھی سمجھ رکھنا چاہیے کہ ایمان، رسماً زبان سے چند الفاظ دہرا دینے اور اس طرح امتِ مسلمہ کے ساتھ وابستہ ہو جانے کا نام نہیں۔ وہ بدوی قبائل، جنہوں نے اسلامی مملکت کی شوکت و عظمت دیکھ کر اس کی فرماں پذیری قبول کر لی تھی، اپنے آپ کو مومن کہنے لگ گئے تھے۔ حضورؐ سے کہا گیا کہ ان سے کہہ دو کہ لَمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ .... تم ابھی ایمان نہیں لائے، کیونکہ ایمان تمہارے دل کی

گہرائیوں میں نہیں اترا۔ تم سردست اتنا ہی کہو کہ ہم نے اس مملکت کے سامنے سرِ تسلیم کر دیا ہے ۔۔۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۔ (۴۹/۱۵) (حقیقت مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور اس نظریۂ زندگی کی صداقت کے متعلق ان کے دل میں کسی قسم کا شک یا اضطراب پیدا نہیں ہوتا۔ اور وہ اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے مصروفِ جدوجہد رہتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے دعویٰ کو اپنے عمل سے سچا کر دکھاتے ہیں۔

اور یہاں سے ہمارے سامنے ایک اور اہم حقیقت آجاتی ہے، اور وہ یہ کہ ایمان اسی وقت ایمان کہلا سکتا ہے جب اس کا مظاہرہ انسانی اعمال و کردار سے ہو۔ بات ہے بھی واضح۔ ایمان کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ انسانی جدوجہد صحیح نتائج پیدا کرے۔ اگر جدوجہد ہی نہ ہو تو ایمان نتائج کیا پیدا کرے گا؟ آپ زراعت سے متعلق قوانین سے ہزار واقفیت رکھیں، اور ان قوانین کی صداقت پر آپ کو لاکھ یقین ہو آپ کی زمین سے فصل اسی وقت پیدا ہوگی جب آپ ان قوانین کے مطابق کھیتی کریں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی وضاحت قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر کی ہے۔ مثلاً سورۂ عنکبوت میں ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (۲۹/۲)۔ کیا لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، چھوڑ دیئے جائیں گے اور وہ ان بھٹیوں میں سے نہیں گزارے جائیں گے جن سے گزر کر سونا کندن بنتا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے کہ جب منافقین آکہتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو ان سے کہا جاتا تھا کہ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۔ (۹/۱۰۵)۔ (تمہارا دعویٰ ایمان ہم نے سن لیا ہے۔ اب) تم کچھ کام کر کے دکھاؤ۔ خدا اور اس کا رسول اور جماعتِ مومنین، تمہارے کام دیکھ کر اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ تم واقعی ایمان لے آئے ہو یا یونہی رسماً الفاظ کا دہرا دینا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے کہ جب قانونِ مکافات کی رو سے، لوگوں کی غلط روش کی پیدا کردہ تباہیاں سامنے آجائیں گی تو اس وقت نہ تو اس شخص کا ایمان اسے کچھ فائدہ دے گا جو ان تباہیوں کو دیکھ کر ایمان لائے گا۔ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا (۶/۱۵۸) اور نہ ہی اس شخص کا ایمان جس کے ایمان کے ساتھ اچھے اعمال شامل نہ ہوں گے۔ اسی سورۃ میں دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ خدا لوگوں کے خالی دعوائے ایمان کی بنا پر ان کا دوست اور کارساز نہیں ہوتا۔ هُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ (۶/۱۲۷) وہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کا دوست ہوتا ہے۔ یہ "ایمان بلا عمل" والے ہی ہیں جن کے متعلق کہا کہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (۲/۸) لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں لیکن وہ مومن ہوتے نہیں۔ ایمان، انسانی اعمال کے لئے جذبۂ محرکہ ہوتا ہے جو

جذبۂ اعمال کا محرک نہیں بنتا، وہ ایمان ہی نہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

مردہ آں ایماں کہ ناید در عمل

(۱)

یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ ایمان اور عمل کا باہمی تعلق کیا ہے۔ بادنیٰ تعمق یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ طبیعی نظریۂ حیات کی رُو سے اخلاق (MORALS) کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اخلاق کا تصور تو اقدار (VALUES) سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جب طبیعی نظریۂ زندگی کی رُو سے مستقل اقدار کا کوئی وجود ہی نہیں تو اس میں اخلاق کا تصور کہاں سے آجائے گا۔ آپ سوچئے کہ جو شخص نہ مستقل اقدار کا قائل ہے اور نہ ہی تسلسلِ حیات یا قانونِ مکافات کو تسلیم کرتا ہے، وہ اگر کوئی "نیک کام" کرتا ہے تو اس کے لئے اس کا جذبۂ محرکہ کیا ہے؟ — ڈین انگے کے الفاظ میں؛

> خدا پر ایمان مرکز ہے اور بقائے حیات پر ایمان محیط۔ تمام مسئلہ اخلاقیات کی یہی کلید ہے۔ وہ مستقل اقدار جن کے توسط سے ہم خدا تک پہنچ سکتے ہیں، ابدی اور غیر فانی ہیں۔
>
> (GOD AND THE ASTRONOMERS)

راشڈل اپنی مشہور کتاب (THE THEORY OF GOOD AND EVIL) میں لکھتا ہے کہ

> یہ ناممکن ہے کہ حقیقت کے متعلق ہمارا نقطۂ نگاہ علم الاخلاق کے بنیادی مسائل پر اثر انداز نہ ہو اور اخلاقیات کے متعلق ہمارا نظریہ، تصورِ حقیقت کو متاثر نہ کرے۔۔۔۔ لہٰذا اخلاقی قوانین کے مستقل اور مطلق ہونے کے لئے خدا پر ایمان لاینفک ہے۔

اور (DESTOIEVSKY) نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

> اگر خدا کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے تو دنیا میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے۔[1]

بات بالکل واضح ہے۔ "خدا پر ایمان" نہ ہو تو نظریۂ زندگی طبیعی رہ جاتا ہے اور اس نظریہ کی رُو سے زندگی، حیوانی سطح پر آجاتی ہے۔ حیوانی زندگی، بنیادی جبلتوں (BASIC INSTINCTS) کے سہارے قائم رہتی ہے۔ ان میں سب سے پہلا جذبہ، تحفظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) ہے۔ اس جذبہ کا تقاضا ہے کہ ایک فرد زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹے، اور چونکہ (حیوانی سطحِ زندگی پر) مستقل اقدار کا تصور نہیں ہوتا، اس لئے "اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹنے" کے سلسلہ میں "جائز اور ناجائز" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ سوسائٹی کے قوانین کا رُخ کرنا ہوتے ہیں۔ سوال تو سوسائٹی کے قوانین سے اعراض (EVASION) کی

---

[1] ان امور کی تفصیل کے لئے دیکھئے۔ پرویز صاحب کی تالیف "انسان نے کیا سوچا"۔ باب اخلاقیات۔

سینکڑوں شکلیں انسان تراش لیتا' اور تراش سکتا ہے۔ اور دوسرے' سوسائٹی کے قوانین' خود ان افراد کے مرتب کردہ ہوتے ہیں جو" زیادہ سے زیادہ سمیٹنے" میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔

اس نظریہ کے حاملین سے یہ توقع کرنا کہ وہ جان مار کر محنت کریں اور اپنی محنت کی کمائی میں سے زیادہ سے زیادہ دوسروں کے لئے دے دیں' اس نظریہ کی اصل و اساس کے خلاف ہے۔ جو' حیوانی جذبہ تحفظ خویش کے تابع' دوسروں کا سب کچھ سمیٹنے کی فکر میں ہو' وہ اپنا سب کچھ دوسروں کو کیسے دیدیگا۔ اس نظریہ زندگی کے حامل' اگر دوسروں کے لئے کچھ دے دینگے بھی' تو اس کا جذبہ محرکہ کچھ اور ہوگا — مروجہ قانون کا ڈر' ستائش کی تمنا، صلہ کی امید' سوسائٹی میں پاپولر ہونے کا جذبہ — قرآن کریم اس جذبہ محرکہ کو " ریاء النّاس[1] " کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۃ النساء میں ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (۴/۳۸) جو لوگ اپنے مال و دولت کو لوگوں کو دکھانے کی خاطر خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے — آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم نے کس وضاحت سے یہ بات کہی ہے کہ اگر خدا اور آخرت پر ایمان نہ ہو تو پھر انفاق کا جذبہ محرکہ ریاءالناس کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ دوسری جگہ ہے کہ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا (۹/۹۸) یا ان لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قانون کے خوف یا حکام کی خوشنودی کے لئے عطیات دیتے ہیں تو چونکہ اس کا جذبہ محرکہ ان کے دل کا تقاضا نہیں ہوتا اس لئے ایسا محسوس کرتے ہیں گویا چٹی بھر رہے ہوں (جرمانہ ادا کر رہے ہوں) اس کے مقابلہ میں' جو لوگ " انفاق فی سبیل اللہ " کرتے ہیں — یعنی مستقل اقدار اور تسلسل حیات پر ایمان رکھتے ہوئے' رفاہِ عامہ کے لئے اپنی کمائی کو کھلا رکھنے والے — ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ جنہیں کچھ دیتے ہیں' ان پر کسی قسم کا احسان نہیں دھرتے، انہیں بطور خیرات نہیں دیتے جس سے ان کے جذبہ عزتِ نفس کو ٹھیس لگے۔ (۲/۲۶۲) وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان ضرورت مندوں کا حق ہے جسے وہ ادا کر رہے ہیں — وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔ (۷۰/۲۵)۔ لہٰذا' وہ ان سے کہتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۔ (۷۶/۹) ہم تم سے اس کا نہ کوئی صلہ مانگتے ہیں' نہ ہی ہم شکریہ تک کے متمنی ہیں۔ اسی لئے جماعتِ مومنین سے کہا گیا کہ

جو کچھ تم ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیتے ہو' اس کا احسان

[1] جب اچھے دنوں میں' ہنوز ہمارے سامنے مستقل اقدار کا تصور تھا' تو "ریاکاری" کی اصطلاح فریب کاری کے معنوں میں استعمال ہوتی تھی۔ "وہ بڑا ریاکار ہے" اس کے معنی ہی یہ ہوتے تھے کہ وہ بڑا چالباز اور فریب کار ہے۔ اب ریاکاری' معاشرہ کا عام معمول ہو چکی ہے۔ اسے اب (POPULARITY) سمجھا جاتا ہے۔

جتا کر اور یوں ان کی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچا کر، اپنے کئے کرائے کو ضائع نہ کرو، اس شخص کی مانند جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اور لوگوں کو دکھانے کی خاطر اپنا مال خرچ کرتا ہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ پتھر کی کسی چٹان پر ذرا سی مٹی پڑی ہو۔ اس پر زور کی بارش پڑے، اور وہ اس مٹی کو بہا کر لے جائے اور وہ چٹان صاف کی صاف رہ جائے.... اس کے برعکس، وہ لوگ جو مستقل اقدارِ خداوندی کی رُو سے اس ایمان کی بنا پر، دوسروں کو دیتے ہیں کہ اس سے ان کی اپنی ذات میں ثبات اور استحکام پیدا ہو جائیگا تو اس کی مثال ایسی ہے کہ اونچی سی زمین پر نہایت عمدہ باغ ہو۔ جب وہی بارش وہاں برسے گی تو اس سے باغ میں دُگنا پھل لگے گا۔ اور اگر وہاں زور کی بارش نہ بھی ہو بلکہ یونہی پھوار سی پڑے تو بھی اس کی سیرابی کے لئے کافی ہو جائے۔ (۲/۲۶۴، ۲۶۵) ؛ (۳/۱۱۶)

اس کے بعد قرآن بتاتا ہے کہ جس معاشی نظام کی بنیاد، خدا اور آخرت کے ایمان پر ہو گی، اس کے نتائج، تمہاری آئندہ نسلوں تک کو بھی متمتع کرتے رہیں گے۔ یہی وہ اساس محکم ہے جس سے اس عمارت کو پائیداری نصیب ہو گی۔ غلط نظام میں "نیکیوں کے کام" کچھ وزن نہیں رکھتے، اس لئے کہ ان کا جذبہ محرکہ محکم نہیں ہوتا۔ سورۃ توبہ میں قریش کو مخاطب کر کے کہا کہ:

کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینا اور کعبہ کی تزئین و آرائش کر دینا، اس شخص (کے کاموں) کی مانند ہو جائے گا جو خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور خدا کی راہ میں مصروفِ جدوجہد رہتا ہے۔ (تم اپنے ذہن سے جو چاہے فیصلہ کر لو) میزانِ خداوندی میں تو یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ (۹/۱۹)

سورۃ بقرہ میں ہے۔

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف، نیکی یہ ہے کہ تم خدا، آخرت، ملائکہ، کتب اور انبیاء پر ایمان لانے کے بعد اپنے مال کو، اس کی کشش و جاذبیت کے باوجود، دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دو ..... (۲/۱۷۷)

کفر کا نظریہ زندگی رکھنے والوں کے متعلق کہا کہ "ان کے اعمال کی مثال یوں سمجھو جیسے راکھ کا ڈھیر ہو اور جھکڑ چلے بہت زور کا۔ وہ اسے اڑا کر لے جائے گا۔ (۱۴/۱۸) کفر کے نظریہ کے معنی یہ ہیں کہ زندگی بس اس دنیا کی زندگی ہے۔ اسلئے ایسے لوگوں کی تمام سعی و عمل کا منتہیٰ اس دنیا کے مفادات ہو سکتے ہیں۔ سورۃ کہف میں ہے۔

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے زیادہ خسارہ میں رہنے والے لوگ کون ہیں! وہ جن کی

> ساری کوششیں اس دنیا کے مفاد کے حصول میں کھو گئیں اور اپنے دل میں سمجھتے رہے کہ ہم بڑے کار ہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قوانینِ خداوندی اور حیاتِ آخرت سے انکار کرتے ہیں۔ سو ان کا کیا کرایا سب رائیگاں چلا گیا۔ نتائج برآمد ہونے کے وقت ان کے اعمال کا وزن کرنے کے لئے میزان تک بھی کھڑی نہیں کی جائے گی۔ (۱۸/۱۰۴-۱۰۵)

سورۂ محمدؐ میں ہے کہ تم روئے زمین پر چلو پھرو۔ اور پھر دیکھو کہ جن قوموں کا نظریۂ حیات ' طبیعی زندگی تھا' اس کا انجام کیا ہوا؟ (۴۷/۹) ان کے اعمال رائیگاں گئے اور آخر الامر وہ بڑے خسارے میں رہے۔ (۴۷/۱۰)[1] ایمان بالآخرت کی اہمیت کے متعلق راشڈال لکھتا ہے:

> انسان کے موجودہ اعمال اس کے مستقبل کو متاثر کرتے ہیں، یعنی جس قسم کے اس کے اعمال آج ہوں گے اسی قسم کا اس کا "کل" ہوگا۔ بالفاظ دیگر اس کے لئے تسلسلِ حیات پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔ جو شخص صرف موجودہ زندگی کا قائل ہے وہ ہمیشہ اپنا فادہ مفاد کے پیچھے لگا رہیگا اور مستقل اقدار کو کچھ اہمیت نہیں دے گا، کیونکہ مستقل اقدار انسانی سیرت کی تعمیر کرتی ہیں اور سیرت کی تعمیر کی اہمیت اسی صورت میں سمجھ میں آسکتی ہیں جب انسان زندگی کو مستقل اور مسلسل سمجھے۔ جو یہ سمجھے کہ میری سانس کے ساتھ میری سیرت کا خاتمہ ہو جائے گا اسے تعمیرِ سیرت کے لئے سر کھپانے کی ضرورت کیا ہے؟

یہ ہے ایمان کا تعلق اعمال کے ساتھ۔ اسے پھر سمجھ لیجئے کہ ایمان (نظریۂ حیات) ہی عمل کے لئے جذبۂ محرکہ بنتا ہے۔ اس لئے اعمال کو ایمان سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ جو جذبہ بھی آپ کے عمل کا محرک ہوگا' وہ آپ کا "ایمان" کہلائیگا۔ ہم اس وقت بات کی وضاحت کے لئے اس اصطلاح کو وسیع معنوں میں استعمال کر رہے ہیں، ورنہ قرآن نے صحیح نظریۂ زندگی کو ایمان اور غلط نظریہ کو کفر — یعنی صحیح نظریہ سے انکار — کہہ کر پکارا ہے۔ اگر آپ "ایمان" کی جگہ نظریۂ زندگی کہہ لیں' تو پھر یوں کہا جائے گا کہ نظریۂ زندگی' ان مقاصد کا تعین کرتا ہے جن کے حصول کے لئے انسان کوشش کرتا ہے۔ یوں ایمان' عمل کی بنیاد قرار پا جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق پیسکال نے کہا ہے کہ

> انسانی ذہن اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی چیز پر ایمان رکھے .... جب اسے ایمان کے لئے کام کی باتیں نہیں ملتیں (یعنی وہ کام کی باتوں پر ایمان نہیں رکھتا) تو وہ بیکار اور خراب مقاصد پر ریجھ جاتا ہے۔ خلا' قدرت کے کارخانے میں محال ہے' اور محض مادی دنیا میں نہیں' بلکہ اخلاقی اور روحانی دنیا میں بھی خلا ناممکن ہے۔ انسان جب

---

[1] قرآن مجید میں اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ مثلاً (۲/۲۱۷)، (۳/۲۲)، (۵/۵۳)، (۹/۶۹)

خدا پر ایمان چھوڑ دے تو شیطان کی پرستش کرنے لگ جاتا ہے۔ اور اچھے نصب العینوں سے دستکش ہو جائے تو بُرے راستے اُسے اچھے لگنے لگ جاتے ہیں۔ یورپ کو اگر اس دلدل سے نکلنا ہے تو اس کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ بے یقینی کی جگہ یقین اور ایمان لے لے۔ بے راہ روی ختم ہو اور یورپ والے نئی قدروں پر ایمان اور نئے اخلاقی ضابطوں سے محبت پیدا کریں۔ وہ زندگی جس پر نہ ایمان کی گرمی ہو اور نہ اخلاقی ضابطہ کی کشش، وہ زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔

"ایمان" درحقیقت انسان کے لئے مقاصد کا تعین کرتا ہے۔ وہ اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ "میں ایسا کیوں کروں"۔ اور جو شخص مستقل اقدارِ حیات (خدا، وحی، رسالت) اور انسانی ذات (مکافاتِ عمل اور حیاتِ آخرت) پر ایمان نہیں رکھتا وہ اس سوال کا اطمینان بخش جواب دے نہیں سکتا کہ وہ دوسروں کی خاطر اپنی جان کیوں مٹائے؟ اگر اس کا جواب کسی دنیاوی فائدے کا حصول نہیں، تو جذباتی ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جذبات کسی نظامِ عمل کے لئے محکم اور پائیدار اساس بن نہیں سکتے۔ اساس محکم تو صحیح نظریۂ حیات کی صداقت پر یقینِ محکم ہی بن سکتا ہے۔ طبیعی نظریۂ حیات نے اسی اساس محکم کو گم کر دیا ہے جس کی وجہ سے افراد اور اقوام دونوں کی زندگی جہنم کی سی ہو رہی ہے۔ عصرِ حاضر کے ممتاز ماہر نفسیات ڈاکٹر ینگ نے اپنی مشہور کتاب (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL) میں لکھا ہے کہ:

میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیۂ نفس کیا، ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جس میں زندگی کے مسائل کے لئے مذہبی زاویۂ نگاہ کی کمی نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس "شے" کو ضائع کر دیا تھا جو زندہ مذہب انسانوں کو مہیا کرتا ہے۔ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی "شے" دیدی جائے جو ان سے گم ہو چکی تھی۔ یہی ان کی دوا تھی — عقیدہ، امید، محبت، نگہ خود بیں۔ (P. 264)

اور یہی "شے" ہمارے ہاں بھی مفقود ہے۔ ہماری دشواری ایک اور بھی ہے۔ ہم جب اپنے آپ کو مسلمان اور دوسروں کو غیر مسلم (کافر) کہتے ہیں تو اس سے سمجھ لیتے ہیں کہ ہم صاحبِ ایمان ہیں اور غیر مسلم کو ایمان نصیب نہیں — اس بنیادی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کے بعد جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اخلاقی حیثیت سے کس قدر پست ہیں اور (بعض) غیر مسلم بڑے اچھے اچھے کام کرتے ہیں، تو ہمارے دل میں لامحالہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان کا اعمال کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اگر ایمان اور اعمال کا تعلق لاینفک ہوتا، تو ہم (مسلمان۔ یعنی صاحبِ ایمان) اچھے کام کرتے اور غیر مسلم اخلاقی اعتبار سے پست سطح پر ہوتے۔ اس خیال کی وجہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، وہ غلط فہمی ہے جس کی رُو سے ہم نے

اپنے آپ کو صاحبِ ایمان سمجھ رکھا ہے۔ (جیسا کہ شروع میں بتایا جا چکا ہے) ایمان ایک نظریۂ حیات کو علیٰ وجہ البصیرت قبول اور اختیار کرنے کا نام ہے۔ یہ قلب و دماغ کا ایک مثبت عمل ہے جس سے انسان میں ایک خاص قسم کی نفسیاتی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ یہی نظریہ انسانی زندگی کے لئے مقاصد کا تعین کرتا ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے جد و جہد کو "نیک کام" کہا جاتا ہے۔ اس نظریۂ زندگی (ایمان) اور اس کی بنیادوں پر اٹھی ہوئی نیک اعمال (اعمالِ صالح) کی عمارت کا نام "الاسلام" ہے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ

(۱) اسلامی مملکت اسے کہیں گے جس کا تمام کاروبار (کوئی ایک گوشہ نہیں بلکہ تمام کاروبار) وحی (قرآن) کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تابع سرانجام پائے۔ اس قسم کی مملکت کے نظام کو اسلامی نظام کہا جائے گا۔

(۲) یہ ہو نہیں سکتا کہ مملکت کا کوئی ایک گوشہ (سیاسی، معاشرتی، معاشی) تو اسلامی ہو اور باقی شعبے غیر اسلامی ہوں یا باقی تمام شعبے اسلامی ہوں اور کوئی ایک شعبہ غیر اسلامی ہو۔ اگر مملکت کا کوئی ایک گوشہ بھی غیر اسلامی ہوگا تو وہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکے گی۔ اسلامی مملکت کا ہر گوشہ اسلامی ہوتا ہے۔ جنت کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا جسے جہنم کہا جا سکے۔ نہ ہی جہنم کا کوئی ایک گوشہ جنت قرار پا سکتا ہے۔ جس طرح انسان کا کوئی حصہ مومن اور کوئی حصہ کافر نہیں ہوتا اسی طرح مملکت کا ایک گوشہ اسلامی اور دوسرا گوشہ غیر اسلامی نہیں ہو سکتا۔

(۳) اس قسم کی (اسلامی) مملکت ان لوگوں کے ہاتھوں قیام پذیر ہوتی ہے جو خدا، وحی، رسالت (مستقل اقدارِ حیات) انسانی ذات، قانونِ مکافاتِ عمل اور تسلسلِ حیات (مرنے کے بعد کی زندگی) پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھیں، اور ان کے اس یقین (ایمان) کا مظاہرہ ان کے اعمالِ حیات، ان کی سیرت و کردار، ان کے روزمرہ کے کاموں سے ہوتا ہے۔ انہی افراد کی ہیئتِ اجتماعیہ کو ملتِ اسلامیہ، امتِ مسلمہ، جماعتِ مومنین، کہا جاتا ہے ـــــ مملکت، قرار دادِ مقاصد پاس کرنے یا چند شرعی قوانین نافذ، یا کوئی خاص معاشی پروگرام اختیار کرنے سے اسلامی نہیں بن جاتی ـــــ نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر!

پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

لاہور میں محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم ہر اتوار کی صبح ۱۰ بجے بمقام ۲۵ ـ بی گلبرگ ۲۔ لاہور ـــــ منعقد ہوتا ہے۔

خواتین کے لئے پردہ کا معقول انتظام ہے　　ناظم

قائداعظمؒ اور دو قومی نظریہ

مطالبہ پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر تھی کہ اسلام کی رُو سے قومیت کا معیار اشتراکِ وطن نہیں بلکہ ایمان کا اشتراک ہے اور اس بنا پر ہندوستان میں بسنے والے مسلمان، ہندوؤں سے الگ ایک مستقل قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں (بلکہ یوں کہیے کہ مطالبہ پاکستان کے حامیوں اور مخالفوں) میں مابہ النزاع تھا۔ یہ سوال کہ جب اس طرح مسلمانوں کی اپنی الگ مملکت قائم ہو گئی تو اس کا نقشہ کیا ہوگا، مابہ النزاع نہیں تھا۔ ہندوؤں کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ مسلمان اپنی مملکت کس نقشہ کے مطابق قائم کریں گے، وہ دو قومی نظریہ کے خلاف تھے جو مطالبہ پاکستان کی بنیاد تھا۔ اور یہی وہ مسئلہ تھا جس پر قائداعظمؒ نے ہندو اور انگریز دونوں سے دس سال تک لڑائی لڑی تھی۔

اس باب میں قائداعظمؒ کا ذہن اس قدر صاف تھا کہ انہیں نہ اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آتی اور نہ ہی اس کے پیش کرنے میں کسی قسم کا الجھاؤ پیدا ہوتا۔ اُن کے ان چند الفاظ کو سامنے لائیے جو انہوں نے (۸ مارچ ۱۹۴۴ء) کو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں اپنی ایک تقریر کے دوران میں کہے تھے ـــــ یعنی

> پاکستان اس دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

اور سوچیے کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کی نگاہ کتنی گہرائیوں تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس تقریر کے قریب دو ہفتہ بعد انہوں نے (۲۱ مارچ ۱۹۴۴ء کو) پنجاب سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

> میں نہیں سمجھتا کہ کوئی دیانتدار آدمی اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ مسلمان بجائے خویش ہندوؤں سے الگ مستقل قوم ہیں۔

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

> ہم دونوں فرقوں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

(ایڈورڈس کالج۔ پشاور کی تقریر - ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء)

جداگانہ قومیت کا یہی وہ تصور تھا جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے اس شد و مد کے ساتھ ہوتی تھی۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں (مارچ ۱۹۳۷ء میں) کہا تھا کہ

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

انہوں نے اپنی سوانح عمری میں لکھا تھا۔

مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔

جب قائداعظمؒ نے اس تصورِ قومیت پر بار بار زور دیا تو مسٹر گاندھی نے انہیں دو مرتبہ ۱۵ ستمبر ۱۹۴۴ء کو ایک خط میں لکھا:

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آبا و اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو وہ اور ان کی اولاد یہ دعویٰ کریں کہ وہ اپنے آبا و اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیئے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

مسٹر گاندھی کا یہ خط یوں سمجھئے کہ قائداعظم کے اس خط کے جواب میں تھا جس میں انہوں نے مسٹر گاندھی کو لکھا تھا کہ

اس بات میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکا ہے نہ شک و شبہ کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ملک ایک ہے۔ یہ برصغیر مختلف اقوام کا مجموعہ ہے جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کونسی قوت محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بعمل کرتا ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصلاح ہے، تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے ..... (لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں) آج انسانی سعی و کاوش کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی امور کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کو نوعِ انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا

کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں اور جب زندگی ایسی بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(جناح کا خط بنام گاندھی۔ جنوری ۱۹۴۴ء)

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۴۰ء تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا تھا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں قائداعظمؒ نے فرمایا تھا۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے۔ ہندو اور مسلمان مذہب کے ہر معاملہ میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ مملکت میں یکجا کر دینا باہمی نافہمی کو بڑھاتے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

اس کے ایک سال بعد انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدراس کے خطبۂ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا۔

مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔

قائداعظمؒ نے اس دعویٰ کو اس شد و مد سے دہرایا کہ ان کے مخالفین تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ایک ممتاز رکن مسٹر این۔ سی۔ دت نے اپنے ابنائے قوم کے نام ایک کھلی چٹھی میں (جو اخبار مدینہ۔ بجنور کی یکم فروری ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی) لکھا تھا۔

اِن حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم قضیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو

اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کرنے کے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ یہ میرے خیال میں، اب نہیں تو کل حقیقت ہو کر رہے گا۔... ... میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہیئے البتہ اس میں مناسب ترمیم و اصلاح کر کے، اسے اپنے حسبِ حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اور اس حقیقت کو بالآخر ہندو اور انگریز دونوں کو تسلیم کرنا پڑا اور دو قومی نظریہ کی بنا پر پاکستان وجود میں آگیا۔ اس موضوع پر قائداعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے اور بھی بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ انہی اقتباسات سے واضح ہو گیا ہوگا کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے خیالات اس قدر صاف اور واضح تھے کہ اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد اس مملکت کی اس اصل و بنیاد کو اس طرح نظر انداز کیا گیا ہے گویا یہ ریلوے کا ٹکٹ تھا جسے سفر کے خاتمہ پر ٹکٹ کلکٹر کے حوالے کر دیا گیا ہو کہ جس مقصد کے لئے وہ ٹکٹ خریدا گیا تھا وہ حاصل ہو گیا اور اس کے بعد اس کی کوئی حیثیت اور ضرورت باقی نہیں رہی۔ پھر اس باب میں بھی قوم کی دو رُخی بڑی تعجب انگیز ہے۔ جب یہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے دو بازوؤں کا ذکر کرتے ہیں تو بڑے زور و شور سے کہتے ہیں کہ دیکھئے! اس قدر بُعدِ مسافت کے باوجود اسلام میں وہ رشتہ ہے جس نے ان علاقوں کے مسلمانوں کو ایک قوم کے رشتہ میں منسلک کر رکھا ہے۔ اگر مذہب کا رشتہ درمیان میں نہ رہے تو ان میں کوئی وجہِ جامعیت باقی نہیں رہتی۔ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے اور دوسری طرف، پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ملا کر ایک قوم بھی تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ اور ستم بالائے ستم کہ اس باب میں سہارا لیا جاتا ہے خود قائداعظمؒ ہی کی ایک تقریر کا جو انہوں نے پاکستان کی پہلی مجلسِ آئین ساز میں خطاب کرتے ہوئے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو ارشاد فرمائی تھی۔ آیئے ہم ذرا اس تقریر کا بھی جائزہ لیتے چلیں۔ انہوں نے مملکتِ پاکستان کے باشندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔

تم آزاد ہو، تمہیں اس امر کی کامل آزادی ہے کہ تم اپنے مندروں میں جاؤ یا مسجدوں میں یا مملکتِ پاکستان میں کسی اور پرستش گاہ میں۔ تمہاری ذات یا مشرب کچھ بھی ہو، امورِ مملکت کو اس سے کچھ واسطہ نہیں ہوگا۔ . . . . میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے نصب العین رکھنا چاہیئے کہ ایک وقت کے بعد نہ ہندو، ہندو رہے گا، نہ مسلمان، مسلمان — مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں کیونکہ وہ تو ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے — ایسا پاکستان کے

شہری ہونے کی حیثیت سے سیاسی نقطۂ نگاہ سے ہوگا۔

قائداعظمؒ کے ان الفاظ کو، وحی خداوندی کی طرح پیش کر کے کہا جاتا ہے کہ دیکھئے۔ اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک نہیں بلکہ وطن کا اشتراک ہے، اس لئے دو قومی نظریہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے جا کر کہا جاتا ہے کہ مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔ یعنی قائداعظمؒ کو سند قرار دے کر ان دونوں ستونوں کو گرا دیا جاتا ہے جن پر مملکتِ پاکستان کی عمارت استوار ہوئی ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ اس سے صورتِ حال کیا سامنے آتی ہے۔

(۱) اگر مندرجہ بالا الفاظ کسی ایسے شخص کی زبان سے نکلیں جس نے نظریۂ قومیت کے متعلق اس سے پہلے کچھ نہ کہا ہو (یا وہ متحدہ قومیت کا قائل رہا ہو) تو ان الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کہنے والے کا مسلک یہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں اور قومیت کا معیار مذہب نہیں، وطن ہے۔ لیکن جب اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے کہ یہ الفاظ اُس شخص کی زبان سے نکلے ہیں جو دس برس تک، انہی دو بنیادوں پر، تمام دنیا کے خلاف نبرد آزما رہا تھا تو ان سے اس قسم کے نتائج مستنبط کرنے کے لئے جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے، ذرا تامل برتنا چاہیئے۔

(۲) ہم نے بعض لوگوں کو یہاں تک کہتے بھی سنا ہے کہ بے شک قائداعظمؒ دس برس تک یہ دعویٰ کرتے رہے لیکن یہ درحقیقت ایک وکیلانہ حربہ تھا جسے انہوں نے اپنا مقدمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ جب کیس کا فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا تو اس حربہ کی ضرورت نہ رہی۔

ایسا کہنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ یہ کچھ ہم کس شخص کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ ہم برنبائے عقیدت نہیں کہتے، بلکہ یہ حقیقت ہے کہ جو شخص قائداعظمؒ کے کیریکٹر کے متعلق کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے، وہ ان کے خلاف اس قسم کا الزام عائد کرنے کی کبھی جرأت نہیں کرے گا۔ حق گوئی و بے باکی، ان کے کردار کی ایسی خصوصیت تھی جس کا اعتراف ان کے دشمنوں تک کو تھا۔ لنڈن ٹائمز ان کے دوستوں کا نہیں، بہرحال دشمن قوم کا ترجمان تھا۔ اس نے قائداعظم کی وفات پر لکھا تھا۔

> قائداعظمؒ نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعویٰ کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصا ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور شفاف ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہیں تھی۔

لہٰذا، یہ کہنا کہ قائداعظمؒ دس سال تک ایسے نظریات کو (بطور حیلہ سازی) پیش کرتے رہے جن پر انہیں ایمان نہیں

تھا، حقیقت کو جھٹلانا ہے۔ ان کا کردار اس سے بہت بلند تھا جس شخص نے اپنے عمر بھر کے نیشنلزم کے عقیدہ کو جھٹک کر الگ کر دیا اور اس میں نہ مداہنت کو بار پانے دیا نہ کسی مصلحت کو، وہ اس قسم کی منافقانہ روش کبھی اختیار نہیں کر سکتا۔

(۳) ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ قائداعظمؒ نے جب مجلسِ آئین ساز سے خطاب کیا تھا تو ملک کے حالات کیا تھے؟

تقسیم ہند کے ساتھ ہی ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ اس سے مسلمانوں کے دل میں خوف اور دہشت کے ایسے جذبات ابھرے کہ انہوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ سب کچھ چھوڑ چھوڑ، پاکستان میں آکر پناہ لے لیں۔ لیکن ان وحشی درندوں نے ان نہتے قافلوں کو بھی نہ چھوڑا۔ راستہ بھر قتل و غارت گری کی وارداتیں ہوتی رہیں۔ ان کی نوجوان لڑکیوں کو ہزاروں کی تعداد میں جھپٹ کر لے گئے۔ ان کے معصوم بچوں کو نیزوں کی انیوں پر اچھالا گیا۔ اور تو اور، دلّی سے جو گاڑیاں خود حکومت کے عملہ کو لے کر روانہ ہوتیں، یہاں پہنچنے پر ان میں سے زندہ انسانوں کے بجائے لاشوں کے ٹکڑے برآمد ہوتے۔ ظاہر ہے کہ ان وحشیانہ مظالم کا ردِعمل پاکستان کے بعض حصوں میں بھی ہوا، اور اس سے یہاں کے غیر مسلم باشندوں کے دل میں خوف و ہراس، بے اعتمادی اور بے یقینی کے وساوس پیدا ہوتے۔ آپ سوچیئے کہ ایک مملکت، جس کی عمر ابھی ایک دن کی بھی نہ ہوئی ہو، اس قسم کے لرزہ انگیز حالات سے دوچار ہو۔ پھر اس کی کیفیت یہ ہو کہ نہ اس کے پاس ابھی اپنی فوج ہو نہ اسلحہ، نہ سامان ہو نہ پیسہ، تو اس کے سربراہ کے دل پر اس سے کیا نہ گزرتی ہو گی! اس کے ساتھ ہی اسے بھی ذہن میں رکھیئے کہ پاکستان کے اندر خود ایسے عناصر موجود تھے جو ایک طرف یہاں کے غیر مسلموں کے دل میں خوف و ہراس پیدا کر رہے تھے اور دوسری طرف انہیں اشتعال بھی دلا رہے تھے۔ ہندوستان کے اخبارات یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کے خلاف مظالم کی فرضی داستانیں بیان کر کے وہاں کے مسلمانوں سے انتقام کی آگ کو تیز سے تیز تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ اس کے لئے نہایت ضروری تھا کہ یہاں کی غیر مسلم اقلیتوں کو پورا پورا یقین دلایا جائے کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ رہیں گی۔ اور مذہب کی بنا پر ان سے کوئی ناروا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں قائداعظمؒ کو پاکستان میں اپنی پہلی تقریر کرنی پڑی۔ قائداعظمؒ بڑی متوازن شخصیت کے حامل تھے۔ وہ کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوا کرتے تھے۔ لیکن جن حالات سے اُس وقت ملک دوچار تھا اور اتنی عظیم ذمہ داریوں کا جو بوجھ اس مملکت پر آ پڑا تھا، اس کے سربراہ کا ان سے متاثر ہو جانا کوئی غیر فطری امر نہیں تھا۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، وہ غیر مسلموں کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ انہیں یہاں اسی قسم کی حفاظت ملے گی جیسی مسلمانوں کو۔ انہوں نے اپنی تقریر میں جو کچھ کہا تھا اس سے ان کا مقصد یہی تھا۔ لیکن شدتِ جذبات میں وہ الفاظ کے انتخاب میں توازن نہ رکھ سکے۔ ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ

جس نظریہ کی رُو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا، وہ اس نظریہ کو پہلے ہی دن اس طرح نذرِ آتش کر دیں گے، بڑی زیادتی ہے۔ کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کریگا۔

ہم نے جواوپر کہا ہے کہ قائداعظمؒ کی اس تقریر کا مقصد غیر مسلم اقلیتوں کو یقین دلانا تھا کہ ان سے رواداری اور حسن سلوک کا برتاؤ کیا جائے گا تو یہ ہماری اپنی تعبیر نہیں۔ اس کی تشریح خود قائداعظمؒ نے تین ہی دن بعد اپنی دوسری تقریر میں کر دی۔ مذکورہ بالا تقریر ۱۱ اگست کو کی گئی تھی اور ۱۴ اگست کو انہوں نے پاکستان کی مجلس آئین ساز کا افتتاح کرتے ہوئے اپنے خطاب میں اس کی وضاحت ان الفاظ میں کر دی۔

> شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس مذہبی رواداری اور حسن سلوک کا ثبوت دیا، وہ ہمارے ہاں کوئی بعد کا وضع کردہ مسلک نہیں تھا۔ وہ مسلک ہمارے ہاں تیرہ سو سال پہلے سے چلا آ رہا تھا جب حضور نبی اکرمؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کر لینے کے بعد ان سے لفظاً ہی نہیں بلکہ عملاً انتہائی رواداری برتی اور ان کے مذہب اور عقاید کو عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھا۔ مسلمانوں کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے جہاں جہاں بھی حکومت کی (غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کے) انہی عظیم انسانیت ساز اصولوں پر عمل کیا اور انہی پر ہمیں بھی عمل کرنا چاہیئے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائداعظمؒ نے خود ہی واضح کر دیا کہ غیر مسلم اقلیتوں کی یہاں پوزیشن کیا ہوگی۔

اس کے بعد قائداعظمؒ قریب ایک سال تک زندہ رہے اور اس دوران میں انہوں نے بہت سے مواقع پر تقاریر کیں اور بیانات دیئے۔ جہاں جہاں بھی موقع ملا انہوں نے غیر مسلموں کو ہمیشہ اقلیت کہہ کر پکارا اور انہیں یقین دلایا کہ یہاں اُن سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے گا۔ مثلاً انہوں نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو خالق دینا ہال کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

> ایک اور سوال جو میرے دل میں بار بار ابھرتا ہے اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ میں نے خلوت اور جلوت میں بارہا اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں اقلیتوں کے حسن سلوک کا ثبوت دینا چاہیئے۔ تقسیم ہند کے وقت اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لہٰذا جب تک اقلیتیں مملکت کی وفادار رہیں گی انہیں یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوگا۔

پھر انہوں نے ۳۰ اکتوبر کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

> اسلام ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں اور اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کرے خواہ ان کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف

جو کچھ ہو رہا ہے اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اقلیتوں کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیئے اور اسکے دل میں اس حفاظت کی طرف سے کامل اعتماد پیدا کرنا چاہیئے۔ ہمارا یہی رویہ ہمارے لئے باعث عزت اور وجہ افتخار ہونا چاہیئے۔

۲ فروری ۱۹۴۸ء کو سندھ کے پارسیوں نے قائداعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ "حکومت اس امر کا خاص اہتمام کر رہی ہے کہ اقلیتوں کے دل سے خوف اور بداعتمادی کے تمام شبہات کا ازالہ کر دے"۔ انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا:

اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیں۔ جو لوگ بھی یہاں برضا و رغبت ہم سے تعاون کرینگے ہم ان کے اس تعاون کا گرمجوشی سے استقبال کرینگے۔

انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

ہر غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کریگا کہ ہم نے اپنی انتہائی مشکلات کے اس زمانے میں اپنی اقلیتوں کی جس قدر حفاظت کی ہے اور ان کا جتنا خیال رکھا ہے، ہندوستان میں اس کی کہیں مثال نہیں مل سکتی۔ میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کریں گے۔ پاکستان میں ان کی جان اور مال کی حفاظت ہندوستانی اقلیتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت ہمارا ذمہ ہے اور ہم اس ذمہ داری کو مذہب و ملت کی تمیز سے بلند ہو کر پورا کرتے رہیں گے۔

انہوں نے ۲۴ مارچ کو چٹاگانگ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "ایک غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کریگا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ کہیں بہتر سلوک کیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے درمیان نہ صرف امن و اطمینان سے رہ رہی ہیں بلکہ انہیں اپنے قدم جمانے کی بھی پوری پوری آزادی حاصل ہے"۔

۱۳ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ کے پارسیوں کے ایک وفد نے قائداعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ:

آپ کو معلوم ہے کہ میری اور میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ پاکستان میں بلا تمیز مذہب و ملت، اور بلا لحاظ رنگ و نسل ہر شخص کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔ اقلیتوں کو اس باب میں بالکل مطمئن رہنا چاہیئے۔

آپ نے دیکھا کہ قائداعظمؒ اس تمام دوران میں پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو اقلیت کہہ کر پکارتے رہے۔ اور انہیں ان کی جان، مال اور عزت، آبرو کی حفاظت کا یقین دلاتے رہے۔ انہوں نے کہیں ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں مل کر ایک قوم بن چکے ہیں اس لئے اب ان میں کسی قسم کی تفریق و تمیز باقی نہیں رہی۔ اس کے برعکس وہ اس حقیقت کا اعادہ کرتے رہے کہ مسلمان اپنے مخصوص نظریۂ زندگی کی بنا پر ایک الگ قوم بنتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے اُس براڈ کاسٹ میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کہا کہ

> یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں ہم اُس اسلامی برادری کے افراد ہیں جس میں حقوق، شرف و احترام اور تکریم ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں ہم میں وحدت اور اخوت کا بڑا گہرا اور خاص جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات، ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساس دروں کے مالک ہیں جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتا ہے۔

انہوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۸ء کو مملکتِ پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے اُس پیغام میں جو اُن کی زندگی کا آخری پیغام تھا پاکستان کو "دنیا کی سب سے بڑی مسلم سٹیٹ" کہہ کر پکارا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ انہوں نے اسے "مسلم سٹیٹ" کہا ہو، اس سے پہلے بھی انہوں نے اسے ہر موقعہ پر "مسلم سٹیٹ" ہی قرار دیا تھا۔

ہم پوچھتے ہیں دنیا بھر کے ماہرینِ سیاست سے کہ جو مملکت محض وطنیت کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہو اسے کبھی بھی مسلم سٹیٹ، ہندو سٹیٹ یا عیسائی سٹیٹ کہا جا سکتا ہے؟ یاد رہے کہ وطنیت کی بنیادوں پر مختلف آئیڈیالوجی رکھنے والوں کے امتزاج سے جو قوم متشکل ہوتی ہو اُس کی مملکت ہمیشہ سیکولر ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ کی زندگی کے آخری ایام میں متحدہ قومیت کے مؤید (مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے کہا تھا کہ "قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اس سے حضرتِ علامہؒ کے ساتھ ان کی بحث چل نکلی۔ اس بحث کے دوران علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ،

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہوگا، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پرواہی۔

لہٰذا قائداعظمؒ کا مملکتِ پاکستان کو مسلم سٹیٹ کہنا خود اس امر کی شہادت ہے کہ وہ متحدہ قومیت کے قائل نہیں تھے۔

آخر میں آیئے ہم دیکھیں کہ قائداعظمؒ کی گیارہ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا مفہوم خود غیر مسلم اقلیتیں کیا سمجھتی تھیں۔ کیا انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ اس سے قائداعظمؒ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا اعلان کر رہے ہیں۔ یا یہ کہ اس سے مقصود غیر مسلم اقلیتوں کا تحفظ ہے؟ ـــــ مسٹر جوشوا فضل الدین ایک مشہور مسیحی لیڈر ہیں جب صدر ایوب نے لا کمیشن کا تقرر کیا تو مسٹر جوشوا نے اس سوال پر بحث کی تھی کہ مجوزہ آئین کی بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا۔ (RATIONAL OF PAKISTAN'S CONSTITUTION)۔ (یہ پمفلٹ اس وقت ہمارے سامنے ہے) اس میں انہوں نے پہلے یہ واضح کیا تھا کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کی رُو سے مملکت پاکستان کے دو بنیادی ستون تھے۔ یعنی:

(۱) مملکتِ پاکستان کی بنیاد مذہب پر ہوگی۔ یہی وہ قدر مشترک ہے جو مشرقی اور مغربی بازوؤں میں وحدت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ اور

(۲) اقلیتوں کے لئے تحفظات۔

انہوں نے کہا تھا کہ مجوزہ آئین کو یہ دونوں شرائط پوری کرنی چاہئیں۔ اس کے بعد انہوں نے قائداعظمؒ کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء (اور اس کے ساتھ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی تقاریر) کے اقتباسات دے کر یہ کہا تھا کہ ان کی تعبیر میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قائداعظمؒ کا مقصد یہ تھا کہ یہاں نہ ہندو، ہندو رہے، نہ مسلمان، مسلمان۔ بلکہ دونوں کے امتزاج سے ایک متحدہ قوم متشکل ہو جس کا لازمی نتیجہ سیکولر اندازِ حکومت ہو جائے، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مسٹر جوشوا نے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:-

> یہ کہنا کہ تخلیقِ پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے ـــــ جو خود اس پاکستان کا خالق تھا ـــــ اپنی پہلی ہی تقریر میں کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جس سے اس بات کا دور کا بھی امکان ہے کہ اُس سے پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی، بالکل بالکل پن ہے۔ قائداعظمؒ نے اتنا ہی کہا تھا کہ پاکستان میں بلا لحاظ مذہب و ملت ہر ایک کو مساوی حقوق شہریت حاصل ہوں گے۔

اس کے بعد انہوں نے بڑی پتے کی بات کہی تھی اور وہ یہ کہ چونکہ پاکستان کو لامحالہ ایک مذہبی مملکت بننا ہے اس لئے اس امر کا فیصلہ کہ غیر مسلم اقلیتوں کو کس قسم کے حقوق اور تحفظات حاصل ہو سکتے ہیں، اسلامی فقہ کی رُو سے ہی ہو سکیگا۔ اور اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں امید ہے کہ اس ضمن میں اسلامی فقہ کی تعبیر مذہبی تعصب اور جنون کی رُو سے نہیں کی جائے گی، عقل و فکر کی رُو سے کی جائے گی۔

حیرت ہے کہ قائداعظمؒ کی ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کا صحیح مفہوم غیر مسلموں نے تو سمجھ لیا، لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی تو ان مسلمانوں کی جو ہندوستان میں بھی متحدہ قومیت کے علمبردار بنے اور جواب چھپکے ہی چھپکے یہاں بھی ان جراثیم کو پھیلا رہے ہیں۔ ہم علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ایک بار پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ اگر پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم کے افراد تسلیم کر لیا گیا تو یہ مملکت اسلامی نہیں کہلا سکے گی خواہ اس کے ساتھ "اسلامک" کا لفظ ہزار بار بھی چسپاں کیوں نہ کر دیا جائے۔ اسلامی مملکت صرف اس قوم کے ہاتھوں وجود پذیر ہو سکتی ہے جو اسلامک آئیڈیالوجی (یعنی قرآن) پر ایمان رکھے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف کچھ کہتا ہے، تو اس کی بات اسلام کے بنیادی تصورِ مملکت کے خلاف ہے، خواہ ایسی بات کہنے والا کتنی ہی بڑی شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو۔

طلوعِ اسلام کالج فنڈ

(بہ تسلسل فہرست مطبوعہ طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۷۱ء)

حسب ذیل عطیات بہ تشکر موصول ہوئے۔

۱۔ محترم محمد یوسف صاحبؒ راولپنڈی	۵۰/-	۷۔ محترم حافظ عبدالمجید صاحب۔ پنڈدادن خان	۲۵/-
۲۔ ” عبدالرحمٰن صاحب۔ لاہور	۲/-	۸۔ ” چوہدری محمد حیات صاحب۔ رائے ونڈ	۱۲۰/-
۳۔ ضلع ساہیوال کے ایک مخیر دوست جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے	۳۰/-	۹۔ ” حاجی عبدالرشید صاحب ”	۵۰/-
۴۔ محترم محمد ارشاد صاحب۔ گلبرگ گلی مری	۵/-	۱۰۔ ” محمد جمیل صاحب۔ ”	۲۵/-
۵۔ ” ” ” صاحب۔ پشاور صدر	۴۰/-	۱۱۔ ” حسن دین صاحب۔ ”	۲۵/-
۶۔ محترم محمد اطہر ساتر صاحب۔ انگلینڈ	۳۶/۰۶	۱۲۔ ” خوشی محمد صاحب۔ ”	۱۵/-

(نوٹ) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) ۲۵/بی گلبرگ لاہور کو دیئے گئے عطیات ایس۔ آر۔ او نمبر ۶۵/(K)/۴/۶۵ مورخہ ۴/۶/۶۵، مطبوعہ گزٹ آف پاکستان پارٹ II مورخہ ۱۲/۶/۶۵ کی رو سے انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۲۲ء کی سیکشن ۵/۱۵ کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ) لاہور

شکوک — شبہات — اعتراضات

★ پیدا ہوتے ہیں — کس کے دل میں؟ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں!

★ ان کا جواب آپ کے پاس کیا ہوتا ہے؟ — ماتھے کی شکن، جھڑکی، لاحول

★ کیا اس سے ان کے شکوک رفع ہو جاتے ہیں؟ ......

اگر آپ

ایسا سمجھتے ہیں تو آپ

فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ شکوک رفع ہوتے ہیں دلائل و براہین سے

علم اور بصیرت سے، بشرطیکہ سمجھانے کا طریقہ بھی دلنشیں اور جاذبِ توجہ ہو۔ اگر آپ

فی الواقعہ کسی نوجوان کے دل سے شکوک اور شبہات کی بیخ نکالنا

چاہتے ہیں، تو اسے

سلیم کے نام

خطوط

دیجئے۔

اور پھر دیکھئے کہ اس میں کیا انقلاب آتا ہے۔

قیمت: جلد اول - آٹھ روپے ۸/-، جلد دوم - چھ روپے ۶/-، جلد سوم - چھ روپے ۶/-

ادارۂ طلوع اسلام ۲۵ - بی گلبرگ لاہور

انسانی مسائل کے حل میں

عصرِ انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں

تاریخ انسانی کی تعجب آموز تفصیل آپ کو مسٹر وین صاحب کی مشہور کتاب

اِنسان نے کیا سوچا

میں ملے گی۔ ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطون اعظم سے لے کر آج تک گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں

دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مؤرخین اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرین معاشیات و سیاسیات نے

کیا سوچا؟ — اسے پڑھئے اور سوچئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسانی نے اپنے لئے

کیا جہنم خرید لیا ہے۔

(ملنے کا پتہ)

ادارۂ طلوع اسلام - ۲۵ - بی گلبرگ لاہور

قیمت: بارہ روپے ۱۲/-

زیادہ منافع حاصل کیجئے

اپنی رقم قومی بچت کی اسکیموں میں لگایئے

پوسٹل لائف انشورنس

پوسٹل لائف انشورنس، ملک میں زندگی کے بیمے کا سب سے بڑا ادارہ ہے حکومت کے زیر انتظام، اس کا تمام منافع پالیسی ہولڈروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کی پریمیم کی شرح دوسری انشورنس کمپنیوں کے مقابلے میں بہت کم ہے اور بونس کی شرح سب سے زیادہ ہے

ڈیفنس سیونگز سرٹیفکیٹ

یہ اپنی نوعیت کی واحد سرمایہ کاری ہے جس میں آپ کی رقم سے بہت زیادہ یقینی طور پر سب سے بڑا منافع حاصل کرتی ہیں۔ جس پر انکم ٹیکس بالکل معاف ہے ۱۰ فیصد سالانہ شرح منافع کے علاوہ ان سرٹیفکیٹ کی خریداری میں لگائی ہوئی رقم پر بھی انکم ٹیکس بالکل معاف ہے۔

پوسٹ آفس سیونگ بینک

پوسٹ آفس سیونگ بینک میں سب سے زیادہ منافع ملتا ہے، سیونگ اکاؤنٹ پر ۵½ فیصد ۳ سال تک کے میعادی حسابات پر ۹ فیصد اور منافع مع بونس اسکیم میں ۱۲ فیصد سے زیادہ منافع ملتا ہے۔ آپ سات سال میں اپنی رقم دوگنی کر سکتے ہیں۔ اور اسے کسی وقت بھی نکلوا سکتے ہیں۔ تمام رقم پر انکم ٹیکس بالکل معاف ہے۔

انعامی بانڈ

بچت کی بچت، انعام کا انعام محفوظ بچت کے ساتھ ساتھ ہمیشہ نقد انعامات حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ پانچ روپے ... سے ... روپے تک کے ... انعامات تقسیم کئے جاتے ہیں۔

جاری کردہ: سنٹرل ڈائریکٹوریٹ آف نیشنل سیونگز - اسلام آباد

ORIENT

لختِ لخت

(چوہدری عطاء اللہ - ایڈووکیٹ - ساہی وال)

ساہیوال میں اہلِ دانش کی ایک مجلس ہے۔ جس کے ہفتہ وار اجلاس بڑی باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں اور ان اجلاسوں میں علمی، سیاسی اور ثقافتی موضوعات پر گفتگو ہوتی ہے۔ ضلع کے حاکمِ اعلیٰ ایک وقت میں اس مجلس کے سربراہ تھے۔ اسی دوران ایک مرتبہ مجھے اس مجلس کو اسلام کے معاشی نظام پر خطاب کرنے کا اتفاق ہوا۔ موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے بات اپنے یہاں پائے جانے والے خیر خیرات کے طریقوں تک پہنچی۔ تو میں نے کہا کہ اس نوع کی داد و دہش روحِ اسلام کے منافی ہے۔ کہ اس سے دینے والوں میں پندارِ نفس اور لینے والوں میں تذلیلِ خودی کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن نے ہمیں احترامِ آدمیت کا سبق دیا ہے، وہ ہمیں دوسروں کی امداد کرنے کی تلقین کرتا ہے، تو ہمارے جذباتِ تراحم کو اپیل نہیں کرتا۔ بلکہ قانون کی ایک اچھی دستاویز کی طرح اپنے احکام و فرامین کے حق میں عقلی دلائل پیش کرتا ہے۔ اور احترامِ آدمیت کو بہر صورت قائم رکھتا ہے۔ جن لوگوں پر رحم کھا کر ہم اپنا دستِ کرم ان کی طرف بڑھاتے ہیں۔ اور چند ٹکے ان کی جھولی میں ڈال کر سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ہم نے ان پر بڑا احسان کیا ہے۔ قرآن انہیں اس سے مختلف سلوک کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ "وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ" کا حکم سناتے ہوئے قرآن نے معاشرے کے ان افراد کو اہلِ ثروت کے مقابل بے باک اور بے خوف فریق کی حیثیت سے لا کھڑا کیا ہے۔ اب انہیں دولت مندوں سے لجاجت اور انکساری کے ساتھ بھیک نہیں مانگنا ہے۔ بلکہ ایک جانے اور بوجھے ہوئے حق کا مطالبہ جرأت اور دلیری کے ساتھ کرنا ہے۔

قبل اس کے کہ میں بات کو آگے بڑھاتا، صدرِ مجلس کرسیٔ صدارت سے اٹھ کھڑے ہوئے، اور مجھے میرے بازو سے تھامتے ہوئے انہوں نے فرمایا "تو آپ کی بات کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو جب مجھے خزانۂ سرکار سے تنخواہ ملتی ہے۔ اس روز شہر کے بھیک منگوں اور کنگلوں کو اذنِ عام ہوگا۔ کہ سب مل کر میری رہائش گاہ پر چڑھ دوڑیں۔ کوئی میرا دایاں بازو تھام لے، کوئی بایاں، کوئی میری ٹانگوں سے لپٹ جائے اور کوئی مجھ سے گلو گیر ہو جائے اور وہ سب یک زبان ہو کر مجھے اپنا الٹی میٹم سنا دیں۔ کہ تمہاری کمائی میں ہم سب کا حق ہے۔ بھلے مانس بنو اور ہمارا حق ہمارے حوالے کر دو، ورنہ ہم ابھی تمہارا ٹینٹوا دباتے ہیں"۔

میں نے جواب میں عرض کیا کہ معاملہ کی نوعیت یوں نہ ہوگی۔ مجھے اجازت دیجئے، میں وضاحت کئے دیتا ہوں۔ بات کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا۔ قرآنی معاشرے میں ایسی ہڑبونگ نہ مچیگی۔ کوئی سائل اور محروم (جنہیں آپ بھک منگے اور کنگلے کہتے ہیں) آپ کے ہاں مانگنے بھیک کو نہ آئیں گے کہ اس معاشرہ میں سائل اور محروم بھی اولادِ آدم ہونے کی جہت سے معاشرے کے معزز افراد متصور ہوں گے اور ان کی عزتِ نفس کی پاسبانی بھی حکومت کے فرائض میں شامل ہوگی، وہ اپنا حق حکومت سے طلب کریں گے۔ بلکہ مانگنے کی نوبت ہی نہ آئے گی کہ ہر حق حکومت خود بخود ان تک پہنچانے کی ذمہ دار ہوگی۔ حکومت اپنی اس ذمہ داری کو یوں پورا کرے گی کہ جو افرادِ معاشرہ اپنی ضرورت سے زیادہ کما لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کی محنت کے ماحصل میں سے بقدر اُن کی ضرورت کے ان کے پاس رہنے دیا جائے گا۔ اور اس سے فاضل جو کچھ ہوگا۔ اُسے بیت المال یا حکومت کے خزانہ میں پہنچا دیا جائے گا۔ سائلین اور محرومین کی ضروریات بیت المال سے پوری ہوں گی، اور یوں حق داروں کو ان کا حق ملتا رہے گا۔

قرآنی مؤقف کے حق میں میں نے عہدِ حاضر کی غیر مسلم فلاحی مملکتوں کی مثال پیش کی۔ جو سائلین اور محرومین کے اس قرآنی حق کو غیر شعوری طور پر تسلیم کئے ہوئے اور اپنائے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں کام کرنے کے لائق ہر فردِ معاشرہ کو یا تو ایسا کام مہیا کیا جاتا ہے۔ جس سے اس کی تمام جائز ضرورتیں پوری ہوسکیں اور یا ایسے بیکاری کا وظیفہ (DOLE) دیا جاتا ہے۔ جو افراد کسی جسمانی نقص، بیماری یا تقاضائے عمر کے سبب کام کرنے کے اہل نہیں ہوتے، ان کے رزق کی ذمہ داری بھی حکومت پر ہی ہوتی ہے۔ ایسے افراد کو در بدر کی بھیک مانگنے پر مجبور نہیں ہونا پڑتا۔ ان کے لئے حکومت کی تعمیر کی ہوئی پناہ گاہیں موجود ہیں۔ انہیں حکومت کی طرف سے بڑھاپے کی پنشن بھی ملتی ہے۔ انگلستان میں جو پاکستانی اور دیگر غیر ملکی مقیم ہیں، اگرچہ وہ انگلستان کے شہری نہیں ہیں، لیکن وہاں کے معاشرہ اور وہاں کی حکومت نے یہ ذمہ داری ان کے بارہ میں بھی قبول کر رکھی ہے۔

تاہم قرآن کی پیش کردہ تصوراتی ریاست (جس نے عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کے دور میں عملی صورت اختیار کر لی تھی) اور مغرب کی فلاحی ریاست میں ایک نمایاں فرق موجود ہے۔ فلاحی ریاست افراد کی روٹی کی ذمہ داری تو قبول کرتی ہے، اور سائلین و محرومین کو پیٹ کی بھوک سے تو مرنے نہیں دیتی۔ لیکن معاشرے میں پائے جانے والے احساسِ تنہائی کا مداوا اس کے پاس نہیں ہے۔ یتیم یعنی تنہا رہ جانے والوں کی تکریم کا اہتمام اس نوع کی ریاست میں نہیں کیا جاتا۔ مغرب کی فلاحی ریاستیں وسیع و عریض یتیم خانوں کی سی صورت اختیار کئے ہوئے ہیں جہاں کی کثیر آبادی تنہائی کی نہ مٹنے والی افسردگی میں مبتلا ہے۔ ان کے ہاں تکریم اس کی ہے جس کا اپنا ایک گروہ ہے، دھڑہ ہے اور پارٹی ہے، اور پھر پارٹیوں کا عروج و زوال انہیں ہر لحظہ لرزاں و ترساں رکھتا ہے، اس کے خلاف قرآنی ریاست

کا نظامِ ربوبیت جہاں افراد کی طبیعی ضرورتوں کی تسکین کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اس کے ساتھ نشاطِ رُوح اور استحکامِ خودی کی ضمانت بھی دیتا ہے۔ تنہائی اور دردِ یتیمی کا مداوا افراد میں احساسِ اخوت و مروت کی آبیاری و بیداری سے کیا جاتا ہے۔ قرآنی معاشرے میں کسی یتیم یعنی تنہا رہ جانے والے کو احساس نہیں ہونے دیا جاتا۔ کہ وہ کسی بھی اور سے کم محترم ہے، یہ فرق ہوتا ہے ایک فلاحی ریاست اور قرآنی ریاست میں۔ تاہم ریاستوں کی کچھ اور انواع بھی ہیں، جن میں سے ایک نوع وہ ہے جس کی جھلک ہم اپنے دور کے اسلامی ملکوں میں پاتے ہیں۔ کہ یہ وہ ریاستیں ہیں کہ جن میں نہ تو سائل و محروم کے روٹی کے حق کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور نہ ہی یتیم و تنہا کو لائق تکریم سمجھا جاتا اس نوع کی ریاستوں میں مملکتِ خداداد پاکستان کا نام سرِ فہرست دکھائی دیتا ہے۔

بات کی وضاحت ہو چکی تو صدرِ مجلس بات کی تہ کو پا گئے اور بے ساختہ (انگریزی میں) فرمانے لگے کہ "مجھے اس کا اعتراف ہے، کہ میں نے آج کچھ سیکھا ہے۔"

نظامِ ربوبیت کے حق میں آیاتِ قرآنی کے علاوہ میں نے سیرتِ پیغمبرؐ اور صدیقِ اکبرؓ و فاروقِ اعظمؓ کے ادوارِ خلافت کے نظائر سے بھی استدلال کیا۔ تقریر کے خاتمہ پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ "آپ نے حضرت عمرؓ کے فقر و استغنا کی مثالیں تو دی ہیں، لیکن عثمان غنیؓ کے مال و متاع کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ اسلام ہمیں جائز طریقوں سے دولت کمانے اور جائیدادیں کھڑی کرنے سے ہرگز نہیں روکتا۔ اگر بعض خلفاء نے انتہائی سادہ زندگی کو اپنے لئے پسند کیا تھا۔ تو یہ قرآنی احکام کے دباؤ کی وجہ سے نہ تھا۔ کہ قرآن اس قسم کا دباؤ کسی پر نہیں ڈالتا۔ بلکہ یہ زندگی انہوں نے اپنی پسند اور اپنی مرضی سے اختیار کر رکھی تھی۔ رسولِ اکرمؐ کی حدیث ہے کہ میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے جس کسی کی بھی پیروی کی جائے گی باعثِ نجات ہو گی۔"

سوال کا جواب میری طرف سے یہ تھا۔ جب رسالت کا آفتابِ عالمتاب اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ ہمارے سامنے نور پاش ہے، تو ہمیں ستاروں کی جستجو کیوں ہو؟ ــــ عثمان غنیؓ کے تمول کے افسانوں کو ہم کیونکر قبول کر لیں۔ اور اس بات کو کیونکر تسلیم کر لیں۔ کہ رسولؐ کے گھر میں تو کئی کئی دن چولہے میں آگ تک نہیں جلائی جاتی تھی لیکن ان کے ایک جاں نثار ساتھی کے گھر میں دولت کے انبار نے قارون کے خزانوں کو مات کر دیا تھا۔ کیا قرآن میں ہمیں اتباعِ اسوۂ رسول کا حکم نہیں دیا گیا؟ کیا عثمانؓ ذی النورین اس حکم سے واقف نہ تھے؟ ــــ واقف تھے اور ضرور واقف تھے، اور اس پر عمل پیرا بھی تھے، اسلام لانے کے بعد رسولؐ اور دیگر اصحابِ رسول کی طرح حضرت عثمانؓ کی دولت بھی اجتماعی مفادِ ملت کے لئے بیت المال میں پہنچ چکی تھی۔ اور جائز ضروریات سے زائد ایک درہم بھی ان کی ذاتی تحویل میں نہ تھا۔ عثمان غنیؓ اور بعض دیگر اصحابِ رسولؐ کے تمول کے افسانے قارونی ذہن کی اختراع ہیں۔ اور یہ وہ افسانے ہیں جن کی تخلیق ہمارے دورِ ملوکیت و سرمایہ داری میں

ہوتی ہے ۔ سلہ

۲۔ ایک ذاتی مقدمہ کے سلسلہ میں مجھے ہائی کورٹ میں جانا تھا۔ ایک وکیل دوست کی کوٹھی سے ان کے ہمراہ ان کی کار میں سوار ہوا۔ ہم دونوں کار میں بیٹھ چکے تھے کہ دیہاتی حلیئے کا ایک شخص کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہوا۔ وکیل صاحب نے ہاتھ کے اشارہ سے اُسے اپنے پاس بلایا اور کچھ سخت سُست کہا۔ معاً انہیں احساس ہوا کہ ان کے ساتھ میں بھی ان کی کار میں سوار ہوں، ایک زیردست کے ساتھ ان کا یہ سلوک میرے نزدیک ان کی شخصیت کے امیج (IMAGE) کو مجروح نہ کردے۔ لہذا انہوں نے اپنے رویہ کی وضاحت ضروری سمجھی۔ فرمانے لگے: "یہ شخص میرے ہاں جزوقتی مالی کے طور پر کام کرتا ہے، اور میں اسے تیس روپے ماہوار ادا کرتا ہوں۔ گزشتہ دو ماہ سے میں اسے دس روپے زائد دے رہا ہوں کہ میرے والد کی قبر پر گھاس اور پھولدار پودے اگا دے۔ میں کل قبر پر گیا تو میں نے دیکھا کہ دو مہینوں میں اس نے وہاں کچھ کام نہیں کیا ہے، گھاس کا ایک تنکا تک بھی قبر پر موجود نہیں" ۔۔۔ یہ کچھ فرما چکنے کے بعد وکیل صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ ہمارے ملک کے مزدور پیشہ اس قدر کام چور کیوں ہیں کہ اپنی اجرت اور مزدوری وصول کر چکنے پر بھی ٹھیک سے کام نہیں کرتے؟ میرا جواب یہ تھا کہ مزدور کام چور اس لئے ہے کہ سرمایہ دار حرام خور کی مثال ان کے سامنے ہے، جو کرتا کچھ بھی نہیں اور سمیٹ کر سب کچھ لے جاتا ہے۔ اس جواب پر میرے وکیل دوست مسکرا کر رہ گئے۔

۳۔ ایک سیاسی پارٹی کے سربراہ پارٹی کی تشکیل کی غرض سے ساہیوال میں تشریف لائے، مجلس وکلا میں قانون دانوں سے خطاب کیا، اور پھر ایک ایڈووکیٹ دوست کے ہاں ان کے اعزاز میں دیئے گئے عصرانہ میں جو لوگ شریک تھے، ان کے سامنے بھی تقریر فرمائی۔ میں بھی دونوں جگہوں پر موجود تھا۔ ایڈووکیٹ دوست کے ہاں کی تقریب میں جب مہمانِ خصوصی تقریر فرما چکے، تو میں نے ایک سوال پوچھنے کی اجازت چاہی، جو انہوں نے بخوشی دیدی۔

میں نے عرض کیا۔ آپ نے اپنی دونوں تقریروں کے دوران فرمایا ہے کہ آپ سوشلزم کی حمایت اس لئے کر رہے ہیں کہ مفکرِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ اور بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظمؒ دونوں بزرگ فرما چکے ہیں کہ اس کی تائید اسلام

سلہ ہمارے ہاں کی نظام سرمایہ داری کی محافظ مذہبی پیشوائیت، حضرت عثمانؓ کی بے حد و نہایت دولت کے قصے تو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتی رہتی ہے، لیکن ان کے (حضرت عثمانؓ کے) اس اعلان کا کبھی بھولے سے بھی تذکرہ نہیں کرتی، جو انہوں نے ان حملہ آوروں کے سامنے کیا تھا جو انہیں شہید کرنے کیلئے جمع ہو رہے تھے، انہوں نے ان سے کہا تھا:-

میرے پاس اس وقت دو سواری کے اونٹوں کے سوا کوئی اونٹ نہیں اور نہ ہی میرے پاس کوئی اونٹنی یا بکری رہ گئی ہے، حالانکہ خلافت سے پہلے تمام عرب میں میرے پاس سب سے زیادہ اونٹ اور بکریاں تھیں، لیکن آج میرے پاس نہ ایک بکری ہے نہ ہی اونٹ۔ سوائے سواری کے ان دو اونٹوں کے جو میں نے حج کے سفر کے لئے رکھ چھوڑے ہیں۔

کہو! یہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا کہ خدا شاہد ہے کہ یہ بالکل درست ہے۔

(تاریخ طبری ۔ نیا ایڈیشن ۔ جلد ۳ ۔ صفحہ ۳۷۴ ۔ مطبوعہ مصر)

ہمارے نزدیک اس روایت میں "خلافت سے پہلے" کے بجائے "اسلام لانے سے پہلے" کے الفاظ ہونے چاہئیں ۔ (طلوعِ اسلام)

سے ہوتی ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر آپ حضرت علامہ اور قائد اعظمؒ کے حوالے سے بات نہ کرتے۔ تو بھی ہم آپ کی بات کو تسلیم کر لیتے۔ کیونکہ قرآن معاشی ناہمواریوں کی بیخ کنی کرتا ہے اور ارتکازِ زر کے رجحانات کا قلع قمع کرتا ہے، تاہم جو قرآن معاشی استحصال کو روکتا ہے، وہ ہم سے کچھ اور مطالبے بھی کرتا ہے۔ اور وہ ہمیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ جو چیز ہمارے اپنے رجحانِ طبع کے مطابق ہو۔ اس کی تائید میں تو ہم اسلام کا اور قرآن کا سہارا ڈھونڈھیں لیکن جو بات ہمیں اپنے مفاد کے خلاف دکھائی دے، وہ تعلیماتِ قرآن کے عین مطابق ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے ہم روگردانی کر لیں۔

اب میرا مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کے وسیلے سے میرے سامنے ایک مخصوص معاشی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ اور اس کی ہمنوائی کی مجھ سے توقع کی جا رہی ہے، لیکن ایسا کرتے وقت یہ بات بھلا دی گئی ہے۔ کہ میں نے دینِ اسلام کو — فلہٰذا خدا کی آخری کتاب قرآنِ حکیم کو کافۃً قبول کیا ہے۔ جو قرآن معاشی استحصال کے سامنے آہنی دیوار بن جاتا ہے، وہی قرآن فرقہ بندی اور گروہ سازی کو جرمِ عظیم قرار دیتا ہے۔

میری دانست میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے اپنے دورِ حکومت میں جو سب سے اچھا کام کیا تھا۔ وہ یہ تھا۔ کہ برسرِ اقتدار آنے پر انہوں نے تمام سیاسی پارٹیوں کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اور ان کا سب سے خراب کام یہ تھا۔ کہ انہوں نے سیاسی پارٹیوں کو پھر سے بحال کر دیا، ایک پارٹی سے خود کو منسلک کر لیا۔ اور اس کے سربراہ بن گئے۔ آج آپ ہمارے شہر میں ایک نئی پارٹی کے قیام کا مژدہ سنانے تشریف لائے ہیں۔ میرا سوال آپ سے صرف یہ ہے کہ قرآن کی اس آیت کی موجودگی میں ؎ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ؎ بحیثیت ایک مسلمان کے آپ کے پاس کیا جواز اور (JUSTIFICATION) ہے کہ ایک جُدا اور الگ پارٹی کی تشکیل کریں۔ اور قرآن کے ماننے والوں کو دعوت دیں، کہ گروہ بندی اور پارٹی سازی میں وہ آپ کے شریکِ کار بنیں۔ اور آپ کا ہاتھ بٹائیں؟ —

سوال کا جواب ان کی طرف سے یہ تھا۔ " ملک میں بہت سی سیاسی پارٹیاں موجود ہیں، ایک پارٹی ہم نے بھی بنالی ہے۔ جب ہم برسرِ اقتدار آ گئے تو دیکھیں گے۔ کہ اگر مسلمانوں میں اور اسلامی معاشرہ میں مختلف پارٹیوں کا ہونا اور پایا جانا خلافِ قرآن ہے۔ تو ہم تمام پارٹیوں کو ختم کرنے کے احکام جاری ..... کر دینگے"

معذرت

ہمیں افسوس ہے کہ کنونشن کے مذاکرہ کی باقی تقریریں اس اشاعت میں نہیں دی جا سکیں۔ انہیں آئندہ کسی اشاعت میں شائع کر دیا جائے گا۔

(مدیر)

حقائق و عبر

ذلّت کی حقیقی وجہ

گزشتہ انتخابات میں جماعتِ اسلامی کو جو اس قدر ذلت آمیز شکست ہوئی تو اس کے متعلق مختلف توجیہات پیش کی گئیں ۔۔ توجیہات تو پیش کرنی تھیں۔ اس لئے کہ ایک تو امیرِ جماعت مودودی صاحب کی انانیت اس قدر شدید ہے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کرنا سخت توہین سمجھتے ہیں اور دوسرے اس لئے کہ انہوں نے بہرحال بھان متی کے اس کنبے کو برقرار رکھنا اور خود اس کا امیر رہنا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں کسی کی نگاہ اس ذلت کی بنیادی وجہ تک نہیں پہنچی۔ مودودی صاحب حضرات انبیاء کرامؑ کی شان میں بالعموم، اور حضور رسالتمآبؐ کی بارگاہِ اقدس و اعظم میں بالخصوص (معاذ اللہ) ایسی گستاخیاں کرتے چلے آ رہے ہیں جنہیں خدا کا قانونِ مکافات کبھی معاف نہیں کرتا۔ (مثلاً) انہوں نے اپنی میکیاولی سیاست کی تائید میں یہ فتویٰ صادر فرما دیا کہ زندگی کی اہم ضروریات کے لئے جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔ جب اس پر اعتراض کیا گیا تو انہوں نے نہایت دیدہ دلیری سے کہہ دیا کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) ایسا خود حضورؐ نے کیا تھا جب آپؐ نے بعض صحابہؓ کو کعب بن اشرف کے قتل کے لئے مامور کیا تو انہیں اجازت دے دی کہ وہ (پناہ بخدا) عند الضرورت جھوٹ اور فریب سے کام لے سکتے ہیں۔

(۲) جب ان کی جماعت کے بعض حضرات نے ان پر اعتراض کیا کہ آپ اپنی دعوت کے ابتدائی ایام میں جن اصولوں کو پیش کیا کرتے تھے اب عملاً خود ہی ان کی تردید اور تکذیب کر رہے ہیں اس لئے ہم آپ کا ساتھ نہیں دے سکتے، تو انہوں نے کمال ڈھٹائی سے کہہ دیا کہ اگر میں ایسا کرتا ہوں تو کون سی قیامت آ گئی (استغفر اللہ، ثم استغفر اللہ) خود رسول اللہؐ نے بھی تو ایسا ہی کیا تھا۔ آپؐ اپنی دعوت کے ابتدائی ایام میں مساواتِ انسانیہ کی تبلیغ کرتے رہے لیکن جب مدینہ میں اپنی مملکت قائم کر لی تو فرما دیا کہ خلافت میرے اپنے قبیلہ ۔ قریش ۔۔ میں محدود رہے گی۔ آپؐ کا یہ فیصلہ اصولِ مساواتِ انسانیہ کے یکسر خلاف تھا۔

ہم ان کی طرف سے اس قسم کے ہفوات و شطحیات سنا کرتے تھے اور کانپ اٹھتے تھے کہ اس شخص کی جرأتیں کس قدر بے باک ہیں کہ اسے نہ خدا کا خوف ہے نہ رسولؐ کی شرم۔ اور نہ ہی اس کا احساس کہ ۔۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۔۔

تیزی سے خدا کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔

خدا کی یہ گرفت اس عبرت آمیز ذلت کی شکل میں سامنے آئی جو گذشتہ انتخابات میں ان کے لئے وجہِ رسوائی بنی۔ اتنی لمبی مہلت کے بعد جو عذاب آیا کرتا ہے، قرآن کریم نے اسے عَذَابٌ مُّهِينٌ (۲۲) رسوا کن عذاب کہا ہے۔ اس عذاب کے معیّن (ذلت آمیز) ہونے کا اندازہ اِن کے اُن دعاوی سے لگائیے جو یہ الیکشن کے ایک دن پہلے تک اس شد و مد سے کیا کرتے تھے۔

لیکن انہوں نے اس سے بھی عبرت نہیں پکڑی اور اپنی اُس روش کہن سے باز نہ آئے۔ ان سے ایک پوچھنے والے نے پوچھا کہ جب ہم حق پر تھے تو پھر ناکام کیوں رہ گئے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کیا فرمایا، اسے ذرا کلیجہ تھام کر سنیئے۔ کہا کہ اگر ہم ناکام رہ گئے ہیں تو کیا ہوا۔

> بعض انبیاء ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ساری عمر دین کی طرف دعوت دینے میں کھپا دی اور ایک آدمی بھی ان پر ایمان نہ لایا۔[1] (ایشیا۔ ۳ جنوری ۱۹۷۱ء)

اور ان کے مقابلہ میں۔

> جماعتِ اسلامی کو گزشتہ ایک سال کی جدوجہد میں کئی لاکھ نئے حامی مل گئے ہیں۔
>
> (ترجمان القرآن۔ بابت جنوری ۱۹۷۱ء صفحہ ۲۲)

بعض بعض انبیاء کرامؑ تو ایسے گزرے کہ انہوں نے اپنی ساری عمر دین کی طرف دعوت دینے میں کھپا دی اور ایک آدمی بھی ان پر ایمان نہ لایا، اور جماعت اسلامی کی تبلیغ سے ایک سال میں کئی لاکھ نئے حامی مل گئے۔ استغفر اللہ!

سوچئے کہ ایسا کہنے والے کو خدا کی غیرت کا کچھ بھی خوف ہے؟ حضرات انبیاء کرامؑ کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ

> كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ۔ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔ (۵۸/۲۱)
>
> خدا نے یہ لکھ رکھا ہے کہ ہم اور ہمارے رسول یقیناً غالب رہیں گے۔ یہ حقیقت ہے کہ خدا بڑی قوتوں کا مالک اور غلبہ والا ہے۔

ربّ الاعلیٰ کا تو یہ ارشاد ہے کہ ہمارا حتمی فیصلہ ہے۔ اٹل قانون ہے کہ ہم اور ہمارے رسول ہمیشہ غالب رہیں گے۔ اور یہ حضرت۔ یہ ابوالاعلیٰ صاحب۔ اپنی شکست کو چھپانے کے لئے، فرماتے ہیں کہ بعض انبیاء ایسے بھی گزرے ہیں جنہوں نے ساری عمر تبلیغ حق میں کھپا دی اور انہیں ایک بھی حامی نصیب نہ ہوا ۔۔۔ استغفر اللہ!

---

[1] واضح رہے کہ مودودی صاحب اس قسم کی توجیہات کی تائید میں وضعی روایات پیش کرنے کے عادی ہیں چنانچہ اس بیان کے سلسلہ میں بھی انہوں نے کہا ہے کہ "احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ" ۔۔۔ اور "احادیث" سے ان کی مراد ہے وضعی روایات۔

حضرات انبیاء کرامؑ کا مقام تو بہت بلند ہے، خدا نے تو جماعتِ مومنین کے متعلق بھی یہ فرما دیا ہے کہ کَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۰/۴۷) مومنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہے۔ (حَقًّا عَلَيْنَا۔ ہم پر فرض ہے) وَعْدَ اللّٰهِ۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ (۳۰/۶) اور خدا وعدہ خلافی کبھی نہیں کرتا۔ اور اسی لئے اس نے کہہ دیا ہے کہ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹) اگر تم مومن ہو تو تم یقیناً سب غالب رہو گے۔ "ابو الاعلیٰ" (الاعلےٰ کا باپ) نام رکھ لینا آسان ہے لیکن "اعلےٰ" (غالب) ہونے کے لئے مؤمن ہونا بنیادی شرط ہے۔

بہرحال یہ ہے وہ غیرت سوز اور انتہائی شرمناک توجیہ جو ان صاحب نے اپنی شکست پر پردہ ڈالنے کے لئے ارشاد فرمائی ہے اور اس سے ان کے دل میں قطعاً لرزش پیدا نہیں ہوئی کہ میں خدا اور اس کے انبیاء کرامؑ کے باب میں کس قدر گستاخی کر رہا ہوں۔ انہوں نے جو موجودہ ذلت سے بھی عبرت حاصل نہیں کی تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ابھی اس سے بھی زیادہ ذلت آمیز عذاب کا انتظار ہے۔ فَمَا اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ۔ (۲/۱۷۵) حیرت ہے کہ یہ لوگ عذابِ جہنم کے لئے کس قدر دلیر ہو جاتے ہیں۔

واضح رہے کہ ہم یہاں شکست و فتح کے اصولوں کے متعلق بحث نہیں کر رہے۔ ہم صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ مودودی صاحب نے اپنی شکست چھپانے کے لئے جو توجیہ بیان فرمائی ہے وہ ارشاداتِ باری تعالےٰ کے صریح خلاف، اور خدا اور اس کے رسولوں کی جناب میں انتہائی گستاخی ہے۔ نبی تو خدا کے انقلابی پروگرام کی آخری کڑی ہوتا ہے (یعنی ہونا تھا۔ سے کیونکہ حضورؐ ختمی مرتبت کے ساتھ سلسلۂ نبوت ختم ہو گیا) اگر خدائی پروگرام کی آخری کڑی کی بھی یہ حالت ہے کہ ایک نبی ساری عمر دعوتِ حق میں اپنا سر کھپا دے اور ایک آدمی بھی اس پر ایمان نہ لائے تو (معاذ اللہ، معاذ اللہ) خدائی پروگرام کی اس سے زیادہ ناکامی اور کیا ہو گی؟ یہ مودودی صاحب جیسے دیدہ دلیروں کی ہفوات کا نتیجہ تھا جو شِ ملیح آبادی جیسوں کو یہاں تک کہنے کی جرأت ہو گئی کہ

عظیم انسان پیمبروں کی حسرتناک تاریخیں اور ان کی پاک زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں۔ (حکیم۔ بابت نومبر ۱۹۳۷ء)

اور اس حد تک دریدہ دہنی کی جسارت کہ (توبہ، توبہ، نقلِ کفر، کفر نہ باشد)

جس خدا کی "ضربِ آخر" بھی احیٹ کر رہ گئی!

اگر حضرات انبیاء کرامؑ کی بھی (بقول مودودی صاحب) یہ حالت تھی کہ ساری عمر کی دعوت کے بعد ایک شخص بھی ان کا ہمنوا نہ ہو سکا تو ضربِ خداوندی کے احیٹ کر رہ جانے کی اس سے زیادہ واضح شہادت اور کیا ہو گی! (استغفر اللہ)

یہ دونوں ایک ہی قدح سے بہکے ہیں۔